بیکار
دن

بیکار
راتیں

بیکار دن ○ بیکار راتیں

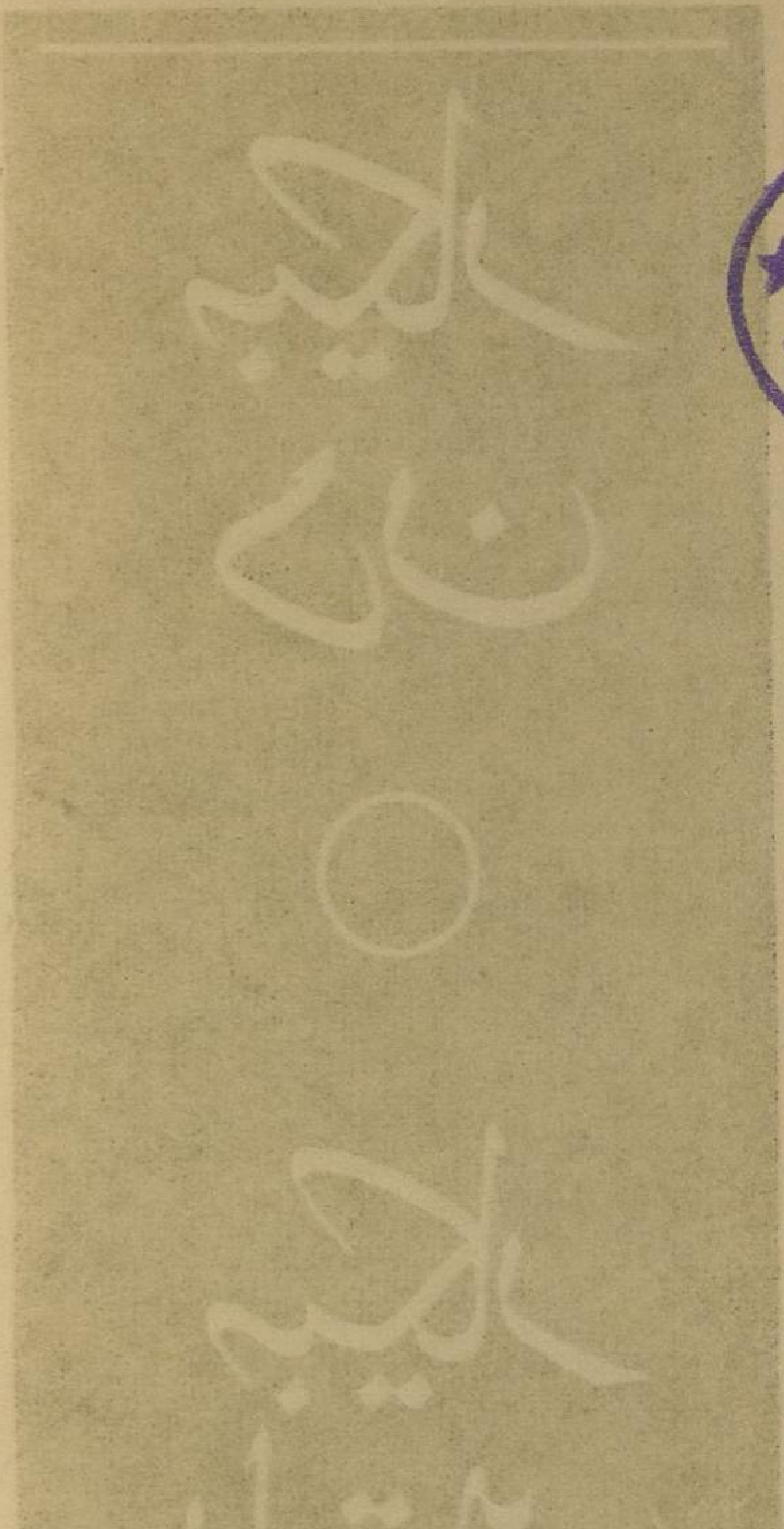
مکتبہ جدید

بیکار دن ○ بیکار راتیں

عزیز احمد

★

مکتبہ جدید، لاہور



قیمت ۳/۸

بار اول — دسمبر ۵۰ء

پبلشرز • مکتبہ جدید، چوک انارکلی، لاہور
پرنٹرز • انشاء پریس، لاہور

احمد علی

کے نام!

فہرست

سستا پلیہ

ناصر نے پھر گھڑی دیکھی۔ رام لال ہاتھ پر ٹھڈی دھرے ہوئے کیب رے کے مسخروں کو دیکھ رہا تھا۔ ناصر نے وہسکی کا گلاس اٹھایا۔ اور قریب قریب نیٹ یعنی خالص وہسکی چڑھا گیا۔ پھر بھاسکر کو ماں کی گالی دے کے کہا۔ وہ اور تارا ابھی تک نہیں آئے۔ اُدھر کیبرے کے مسخرے بار بار ٹانگیں چیر چیر کے فرش پر گر رہے تھے۔ ایک آدھی سے زیادہ ننگی عورت ٹانگیں چھت کی طرف اُٹھائے، دونوں کہنیوں کے بل کھڑی منہ سے رومال اٹھا رہی تھی، جب وہ اٹھا چکی اور پورا ہال تالیوں سے گونجا تو رام لال نے بھی آہستہ سے وہسکی کا گلاس اٹھایا۔ اس طرح جیسے کوئی کسی بڑی نازک سی لڑکی کو پیار کرے، ذرا سی وہسکی چکھی اور پھر کیبرے کی طرف دیکھنے لگا۔

اس نے آہستہ سے سگریٹ سلگایا، اور پھر سگریٹ کیس ناصر کی طرف بڑھا دیا۔
ناصر نے بھاسکر کو پھر گالی دی، اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کوئی بوائے نظر آجائے تو اور وہسکی منگوائے۔

اب کیبرے کے فرش پر دو لڑکیاں قلابازیاں کھا رہی تھیں۔ سرخ و سفید، سنہرے بال ہر قلابازی کے ساتھ بکھر جاتے۔ ان کے اعضا بجلیوں کی طرح کوند رہے تھے۔ نیلی نیلی آنکھیں تیز اسپاٹ لائٹ میں چمک رہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر وہ دائمی مصنوعی مسکراہٹ تھی، جو بچپن سے شروع ہوئی تھی۔ اور جو اس وقت تک باقی رہے گی جب ان کے ہاتھ پاؤں شل ہو جائیں گے۔ اور ان کی کمریں اور ان کے دھڑ قلابازیوں کے کام کے نہ رہیں گے۔ لیکن اس درمیان میں وہ فرش کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک کبھی ایک ہی ساتھ کبھی متضاد سمتوں سے قلابازیاں کھاتی ہوتی اپنے جسم کو ناممکن طریقوں پہ موڑتی ہوئی۔ کبھی عورت، کبھی بچھو، کبھی چھلاوہ معلوم ہوتی ہوئی سارے مجمع پہ سحر سا کر رہی تھیں۔ جو شراب اور سگریٹوں اور اپنے ساتھ کی خوبصورت عورتوں تک کو بھول کے ہر غیر معمولی اور غیر متوقع قلابازی پہ دیوانہ وار تالیاں بجاتا۔ خدا نے نسوانی جسم کو حسین بنایا مرد کو لبھانے کے لئے، افزائش نسل کیلئے مرد نے نسوانی جسم کی دو قسمیں قرار دیں۔ قیدی جس کی قسمت میں عمر قید ہے، اور کھلونا جو قلابازیاں کھاتا ہے، ایک موٹا سا یمن سیٹھ جس نے گیارہ شادیاں کی تھیں، چار شرعی اور سات غیر شرعی اور جس نے ہر بیوی کے نام ایک بلڈنگ لکھ دی تھی، سوچنے لگا کہ اس طرف کی قلابازی کھانے والی کس طرح ہتھے چڑھے گی۔۔۔

رام لال نے انگڑائی لی۔ اور کل صوبہ بمبئی کے فنانس ممبر سے اپنی گفتگو کے متعلق سوچنے لگا۔ اس نے پھر بڑی متانت سے وہسکی کا ایک گھونٹ پیا۔ اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے شارک اسکن کے جاکٹ پر سے سگریٹ کی راکھ کو جھاڑا اور پھر قلا بازی کھانے والیوں کو دیکھنے لگا۔

کسی نے اس کے شانے پہ آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ وہ سمجھا بھاسکر ہوگا۔ لیکن یہ ایک اجنبی تھا۔ ادھیڑ عمر کا۔ نیلے ٹوئیڈ کا سوٹ پہنے، بھڑک دار ٹائی میں سونے کا پن لگائے، جیسے ابھی ابھی اسٹاک ایکسچینج میں سٹہ کھیل کر آ رہا ہو۔ ناصر کی آنکھیں بالکل سرخ تھیں۔ وہ اجنبی کو نہ پہچان کر مُندی سی گئیں۔ مگر رام لال نے اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ اجنبی کے ساتھ ایک چوڑا چکلا سا سفید فام نوجوان تھا، جو یا تو اینگلو انڈین تھا یا پھر اُن سرطان زدہ نوجوانوں میں سے ایک جو بمبئیوں کی تعداد میں ہمیرا سمتھ کے ناچ گھر میں حلقہ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ کسی اچھی لڑکی کی تلاش یا پال جونس کے انتظار میں۔ ان کے پیچھے دو لڑکیاں تھیں ایک قد، سڈول، صحت مند اور بشرے سے ذرا چالاک اور مغرور معلوم ہوتی تھی۔ دوسری پستہ قد، ذرا موٹی سی عمر میں کوئی تیس سال کے لگ بھگ، سیاہ بال کٹے ہوئے مگر بڑی بھاری ساڑی پہنے ہوئے۔

رام لال، اجنبی کی طرف پھر ذرا تعجب سے دیکھ کے، مگر اس کے ساتھ لڑکیوں پر ایک نظر ڈال کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ناصر نے آنکھیں بند کئے ہی کئے دل ہی دل میں

بھاسکر اور تارا کو پھر ایک گالی دی۔ رام لال نے اجنبی سے آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر کچھ پوچھنا چاہا۔ اتنے میں قلابازیاں ختم ہوئیں۔ ننگے ریشمی جسم جن میں ہڈی نہیں ہوتی، مجمع کی تالیوں کے ہجوم میں ازلی ابدی جھوٹی مسکراہٹ کے حصار میں جھکے، پھر جھکے، اور دروازے کے اس طرف غائب ہو گئے۔ ایک دم سے تمام روشنیاں کھلیں اور پورے ہال میں روشنی، باتوں کی آواز اور سگریٹوں کے دھوئیں کا سیلاب آ گیا۔

اجنبی نے رام لال سے کہا۔ "ہم لوگوں کو کوئی میز نہیں مل سکا۔ دیکھئے نا پورا ہال کھچاکھچ بھرا ہوا ہے۔ ہم آپ کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں؟"

رام لال نے کہا۔ "ضرور۔"

"ضرور۔ جی۔ ضرور۔" ناصر نے جھوم کے کہا۔ اور بوائے کو پکار کر سب کے لئے وہسکی لانے کو کہا۔

اور واقعی رام لال نے دیکھا۔ کہ آج تاج محل ہوٹل کے ٹی روم میں بڑا مجمع تھا ایک میز تو کیا ایک کرسی بھی خالی نہ تھی، بوائے دو کرسیاں اور لایا، تب کہیں ادھر اجنبی، سرطان زدہ نوجوان اور دونوں لڑکیوں کے لئے جگہ نکل سکی۔

مائکروفون نے اعلان کیا۔ "اگلا ناچ رمبا ہے۔" ادھیڑ اجنبی چھوٹی موٹی سی عورت کو لے کے ناچنے اٹھا۔ ناصر بھاسکر کو ایک اور گالی دے کے ہاتھ منہ دھونے ہال کے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں بیچ کا حصّہ ناچنے والوں سے بھر گیا۔

وہ ادرک کے رنگ کے بالوں والی لڑکی اس کی ناک سے معلوم ہوتا ہے یہودن ہو گی۔ پولینڈ کی پناہ گزین، اس امریکن لوٹی ننٹ کے گال سے گال ملا کر کس طرح ناچ رہی ہے۔ رام لال نے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ اور یہ انگریز کپتان، اس کی مونچھیں تو دیکھو، پھر ہم جارج پنجم کی حکومت کے ابتدائی زمانے کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ سیاہ پوش لڑکی، دراز قد، بالائی کے بنے ہوئے رخسار نیلے ریشم کی آنکھیں، کس وقار سے ناچ رہی ہے معلوم نہیں پارسی لڑکیاں اب فراک کیوں پہننے لگی ہیں، شاید اس وجہ سے کہ امریکن اور انگریز سپاہی ساڑیوں سے گھبراتے ہیں۔ رام لال نے بڑی احتیاط سے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کے بجھایا اور وہسکی کا ایک ہلکا سا گھونٹ اس طرح لیا گویا یہ اس سیاہ پوش انگریز لڑکی کے بالائی کے بنے ہوئے رخساروں کا لمس تھا۔

دو تین سکھوں نے ناچتے میں پنجابی لڑکیوں کو لپیٹ کے "ہولی چلو" کا نعرہ لگایا۔ انگریز افسران کی طرف کچھ سراسیمگی اور کچھ حقارت سے دیکھ کے اپنے ساتھ کی ناچنے والیوں سے موسم کے متعلق باتیں کرنے لگے میمیں نوجوان افسروں کی آغوشوں میں ناچتے ناچتے مسکرائیں۔ لکھنؤ کی ایک لڑکی نے لدھیانے کے ایک نوجوان سے کہا۔ "دیکھیے پھر آپ مجھ پر ترچھی نظر کا الزام لگائیں گے ......" ایک خوبصورت سے گجراتی سیٹھ نے ایک خوبصورت سی رائے پوری حسینہ سے کہا۔ "اجون سات آٹھ دن میں نیا مال آئے گا ......" اور خوبصورت سی رائے پوری

حسینہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

رام لال نے دیکھا کہ اس کی اپنی میز سے دراز قد، سڈول جسم والی حسینہ اور چوڑے چکلے "سرطان زدہ" نوجوان کی آنکھوں میں باہم شرارے چمکے۔ اس نے دیکھا کہ دونوں کے دانت، صحت مند اور چوڑے چوڑے، چمکنے لگے، اور ایک لمحے کے اندر دونوں رقص کرنے والوں کے ہجوم میں غائب ہو گئے۔

رام لال نے اپنے شارک اسکن کے اُجلے کوٹ پر سے راکھ جھاڑنا چاہی۔ مگر راکھ کہیں گری ہی نہیں تھی۔ اور پھر وہ سوچنے لگا کہ صوبہ بمبئی کا یہ فنانس ممبر کس قسم کا آدمی ہوگا جس سے مجھے کل ملنا ہوگا۔ ریاست کسی اور کو بھیجتی، مجھے کیوں چُنا۔ بوائے نئے گلاسوں میں وہسکی اور برانڈی بھرے ہوئے آیا۔ رام لال کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے سوڈے کے شیشے میز پر رکھ دیئے۔ اور چلا گیا۔ رام لال نے دیکھا، دروازے کے باہر ناصر، بھاسکر اور اس کی بیوی تارا سے محبت کر رہا تھا تارا بھاسکر کے بازو میں بازو ڈالے جھول رہی تھی، اور ناصر کو بیوقوف بنا رہی تھی۔ اور پھر بھاسکر اور تارا اوپر اپنے کمرے کو چلے گئے۔ ناصر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ اور پھر اسی دُبلی سی پارسی رنڈی کو دیکھ کر جو ہر شام سو بار لفٹ میں نیچے سے اوپر جاتی ہے اور سو بار سیڑھیوں سے نیچے اترتی ہے، اگر تاج محل ہوٹل میں کسی کو دیکھ کر لرزہ آجاتا ہے تو اسی کی مکڑی جیسی مسکراہٹ سے ناصر پھر بھاسکر کو گالیاں دیتا ہوا واپس آیا۔ اور رام لال نے چور بازاری میں

خریدے ہوئے چسٹر فیلڈ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ "دیکھا سالا بھاسکر نہیں آیا۔ کہہ رہا تھا کھانا ساتھ کھائیں گے۔ میں تو رٹنز جاتا ہوں۔ رام تیرا جی چاہے تو تُو سالے بھاسکر کے ساتھ کھانا کھالے، ورنہ اس کو اس کی جورو کے ساتھ زہر مار کرنے دے بیٹے نے گھنٹہ بھر انتظار کرایا۔ اور خود سینما چل دیا تھا۔"

وہسکی کا گلاس دو گھونٹ میں چڑھا کے ناصر نے کہا۔ "میں چلا۔"

رام لال نے کہا۔ "بیٹھ تو سہی۔ دیکھ ہمارے میز پر جو لوگ آئے ہیں ذرا ان سے باتیں کریں گے۔ دو لڑکیاں ہیں، شاید گٹھ جائیں۔"

"خاکسار کو تو نیند آرہی ہے۔ رام تیرا جی چاہے تو تُو شکار کھیل۔"

"کھانا بھی نہ کھائے گا؟ انتہا پی کے اگر کھانا نہیں کھائے گا تو دو دن میں جگر بیکار ہو جائے گا۔ مر جائے گا۔"

رام پیارے۔ آج تو یاروں کو نیند بہت آرہی ہے۔ تیرے سر کی قسم یاروں کو دو عورتیں پسند ہیں۔ ایک تو وہسکی۔ کیا بی جان پری خانم ہے۔ واہ واہ اور دوسرے نیند۔ باقی تمام عورتیں رنڈیاں ہیں۔ خدا حافظ۔ رام۔"

اور وہ چل دیا۔

آخر رمبا ختم ہوا، اور ہال بھر میں تمام میزوں پہ ناچتے ہوئے جوڑے واپس آئے۔ جیسے کشتیٔ نوح سے کبوتروں کے سینکڑوں جوڑے کسی نامعلوم جزیرے کو دیکھنے کے لئے اُڑ گئے ہوں، اور تھکاوٹوں کی لذت اور مسکراہٹوں کے جھوٹ

کی شاداب ٹہنیاں اپنے ہونٹوں اور اپنے خون کی روانی میں دبائے ہوئے، پھر اپنے اپنے کابکوں میں آ بیٹھیں۔

رام لال نے اجنبیوں کی طرف وہسکی اور برانڈی کے گلاس بڑھائے۔ اور ادھیڑ اجنبی نے جو اپنی چھوٹی موٹی سی معشوقہ کے ساتھ بڑا کامیاب ناچ، ناچ کے بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ انگریزی میں کہا۔ آیئے ہم سب اپنا تعارف تو کرالیں۔ میرا نام شیو داسانی ہے۔"

"میرا نام رام لال ہے۔"

"بڑی خوشی ہوئی۔"

"بڑی خوشی ہوئی۔"

"یہ۔" اور ادھیڑ اجنبی مسکرایا۔ "ان کو تو آپ نے سینما کے پردے پہ بارہا دیکھا ہوگا۔ ارونا مشہور اسٹار۔ پہلے نیو تھیٹرز میں تھیں۔ اب میری کمپنی میں ہیں۔ ......جی۔ جاگیردار پروڈکشنز۔ اور یہ ان کی بہن ارمیلا...... اور یہ جوجو تمہارا اصلی نام مجھے یاد ہی نہیں رہتا۔"

خالص ترین کاکتی بیں چوڑے چکلے نوجوان نے جواب دیا۔ "ہرگش مایر۔ آپ جانتے ہوں گے یہ جرمن نام ہے۔ مگر میں باش نہیں —— میں اینگلوسیکسن ہوں خاص اینگلوسیکسن۔"

رام لال نے فوراً تصفیہ کر لیا کہ "اینگلو انڈین نہیں ہو سکتا"۔ کا کنی نوجوان نے کہا "خاص اینگلو سیکسن"۔ اور پھر اپنا گلاس اٹھا کے کہا۔ "ہیرس لبسٹ"

"ہیرس لبسٹ"

ایک بڑا سا گھونٹ پی کے کا کنی نوجوان نے کہا۔ "یس سر۔ خالص اینگلو سیکسن کیوں پیٹ"۔

شیو دا سانی نے ہندوستانی میں رام لال کو سمجھایا کہ یہ ارونا کا اصلی نام ہے۔ وہ کلکتہ کی رہنے والی ہے اور یہ اینگلو انڈین ہے، اور اس کا نام پیٹریشیا ہے۔"

سرطان زدہ، کا کنی نوجوان نے کہا۔ لیکن یہ بھی یاد رکھئے۔ میں ہر جگہ یونین جیک گھماتا نہیں پھرتا۔ میں اٹلی کی طرف ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔ نو سر مجھے چرچل نہیں چاہیے۔ نوپ فوکس نوپ۔ وہ سکھ چلا رہے تھے نا ڈھلی چلو۔ ڈھلی چلو، مجھے ان سے ہمدردی ہے۔ سچ مچ مجھے ہمدردی ہے۔" اب فاکس ٹراٹ کا راگ بجنا شروع ہو گیا تھا۔ کا کنی نوجوان کے پاؤں میز کے نیچے تھرکنے لگے اور اس نے اپنی انگلیاں ارونا۔ (پیٹ) کی انگلیوں میں الجھا کے کہا۔ "ڈارلنگ۔ یہ ناچ میرا ہے۔"

"لالچی۔" دراز قد، سڈول، صحت مند اینگلو انڈین ایکٹرس نے جواب دیا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خدا حافظ پا" ارونا (پیٹ) نے ادھیڑ اجنبی شیو دا سانی کی طرف دیکھ کے کہا۔

"خدا حافظ پا" کا کنی نوجوان نے تھرکتے ہوئے کہا۔

شیو داسانی نے موٹا سا چرچل سگار سلگاتے ہوئے رام لال سے کہا۔" دونوں کی نسبت ہوگئی ہے۔"

رام لال نے "اچھا" کہا۔ اور دور کے میز پہ ایک نوجوان جوڑے کو دیکھنے لگا۔ یہ مصر کا قنصل جنرل اور اس کی سکرٹری تھی۔ آنکھیں چار ہوئیں تو اس نے قنصل جنرل کی طرف مسکرا کے دیکھا۔ قنصل جنرل نے مسکرا کے اس کے سوال کا جواب دیا۔

اور یہ دیکھ کر کہ رام لال کی رسائی سوسائٹی میں کافی اوپر تک ہے سیٹھ شیو داسانی نے پوچھا۔" آپ کیا کرتے ہیں۔ بزنس مین ہیں۔"

"نہیں میں سرکاری ملازم ہوں۔ فی الحال تو آنند نگر میں فنانس سکرٹری ہوں؟ اور آپ تو غالباً فلم کمپنی کے ڈائرکٹر ہیں۔"

"پروڈیوسر ڈائرکٹر۔" سیٹھ شیو داسانی نے کہا۔" پہلے میں فلم بیچا کرتا تھا۔ اس سے پہلے اسٹاک بروکر تھا۔ اس سے بھی پہلے لاہور میں ایک بینکنگ کمپنی میں اسی روپے کا ملازم تھا۔ آپ کچھ پئیں گے؟"

"نہیں۔" پھر رام لال نے دیکھا کہ دروازے پر کھڑے بھاسکر اور ونار اس کی طرف اشارا کر رہے ہیں۔ کھانے کے کمرے کو چلنے کے لیے۔" اب آپ اجازت دیں تو میں ذرا اپنے دوستوں کے ساتھ جاؤں۔"

"ضرور۔ ضرور۔ اپنے میز پر جگہ دینے کا بہت شکریہ۔ آپ یہیں ٹھہرے ہیں۔ تاج میں؟"

"جی ہاں۔"

"کمرہ نمبر"

"تینتالیس"

"میرا ٹیلیفون نمبر ۴۸۰۷۱۳ ہے۔ کسی دن آیئے۔ میں میرین ڈرائیو پر رہتا ہوں راج کنول بھون۔ فلیٹ نمبر ۴۔ دیکھیے یہ میرا کارڈ ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" اور اس سے ہاتھ ملا کے رام لال دروازے کی طرف چلا۔ جہاں تارا بھاسکر کے کاندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

دوسرے ہی دن غافل اور ہوشیار سرکار نے قیامت کر دی۔ صبح کو اخباروں میں اعلان چھپا کہ ہزار کے نوٹ واپس کر دیئے جائیں اور تفصیلات بتائی جائیں کہ یہ کس طرح حاصل ہوئے ہیں۔ چور بازار میں ایک بڑا دھماکہ ہوا اور اگرچہ کہ ہزار کے نوٹ بھی بہت جلد چور بازار کی جنس بن گئے۔ مگر فوری اثر جو ہوا وہ ایسا تھا جیسے کسی پر اچانک فالج گرے۔

بمبئی میں اس زمانے میں سیکشن ۹۳ تھا۔ انتخابات ہونے والے تھے۔ کانگریس کی حکومت ابھی برسرِ اقتدار نہیں آئی تھی۔ مگر انکار حکومت کے فنانس ممبر نے رام لال سے چلتے چلتے کہا۔ "ہاں خوب یاد آیا۔ ڈائرکٹر جنرل پولیس نے ٹیلیفون کیا تھا کہ کئی سو

ستاپیسہ۔

یہ آپ کی ریاست آنند نگر گئے ہیں۔ ہزار کے نوٹوں کا لطیفہ آپ کو یاد ہے نا۔۔
گڈ آفٹر نون۔

جب وہ تاج واپس پہنچا۔ تو ٹیلیفون آپریٹر نے کہا نمبر ۲۱۷۸۴ سے آپ کے لئے ٹیلیفون آیا تھا۔

دراز قد، سڈول، صحت مند ایکٹرس ارونا (ہپیٹ) کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ پھر سیٹھ شیو داسانی کے سر کے کھچڑی بال، اور سرطان زدہ نوجوان دور اُفق کے اس پار کہیں غائب ہو گیا۔

لیکن وہ تھکا ہوا تھا۔ ہاتھ منہ دھو کے وہ کھانے کے کمرے میں گیا۔ تاج کا جیسا بد مزہ کھانا شاید ہی کہیں ملتا ہو۔ اس نے منٹ ساس کے ساتھ روسٹ مٹن کو زہر مار کیا۔ ناریل کے پانی کی آئس کریم کھائی۔ کافی گرڈ ڈال کے پی۔ اور بالآخر چور بازار کے بلیک اینڈ وائٹ سگریٹ سے ذرا تشفی ہوئی۔ اور وہ اسی طرح کپڑے پہنے پہنے بستر پر لیٹ گیا۔ پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ آہستہ خرام تاتاری معشوق کی طرح۔ قیامت کی، یا کب لئے کے سفید پوڈر سے چھپے ہوئے جسموں کی قلابازیوں کی چال نہیں تھی۔ اور وہ سوچنے لگا سوا عورت کے میں نے ہر چیز کو معشوقہ سمجھ کے برتا، وسکی کو، اپنی ملازمت کو، پنکھے کی ہوا کو، اپنی قیمتی ٹائیوں کو، اپنے کپڑوں کی کریز کو، چور بازار کے سگریٹوں کو، اپنے لمبے لمبے ناخونوں کو۔۔۔۔۔ پھر اس نے تارا کو اپنے تصور میں بھاسکر کے بازو میں بازو ڈالے تاج کی دوسری منزل پر سیڑھیوں

کے پاس جھولا جھولتے دیکھا اور سوچنے لگا اگر میں نے کبھی شادی کی اور میں اسی طرح کسی کو سرِ راہ جھولا جھولتے دیکھوں گا تو...... اور وہ کوئی قاتل مگر ہلکی اور معشوقانہ سزا سوچنے لگا۔ سب سے اچھی موت وہ ہے جو سمندر کی لہروں کے نیچے، نیلے پانی کے نیچے واقع ہو...... تو میں کسی کو تھیلے میں سی کے سمندر میں ڈال دوں گا...... اس نے ناصر سے ایک جلن سی محسوس کی۔ اُس کی ہر بات میں قیامت اور قلابازی ہے۔ جو چیز ہو اسے ایک گھونٹ میں پی جاتا ہے، روند ڈالتا ہے، مسل ڈالتا ہے۔ خواہ وہسکی ہو، جم خانہ ہی سہی، خواہ عورت ہو، دوست کی بیوی سہی، خواہ سگریٹ ہوں ۵۵۵ ہی سہی جو سوائے چور بازار کے کہیں نہیں ملتے۔

پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ آہستہ خرام تاتاری معشوق کی طرح۔ یہ کائستھ ہونے کی سزا تھی کہ رہو ہندوستان میں اور پڑھو غزلیں، اور تصور کرو تاتاری معشوق کا۔ مثنوی گلزارِ نسیم اور فنانس کی مثلوں، کارروائیوں، ہر سال بجٹ بنانے، اسکیموں، تنخواہوں پر اعتراض کرنے میں کتنا فرق ہے۔ کتنا فرق ہے...

جب وہ سو کر اٹھا تو بھاسکر اور تارا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ کمبخت کبھی جو ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ شادیاں سب کی ہوتی ہیں۔ مگر ایسی شادی شاید ہی کسی کی ہوئی ہو۔ تارا نے ہاتھ جوڑ کے نمستے کیا۔ وہ نمستے کر کے مسکرایا۔ بھاسکر اور تارا اس کے میز پر ٹائم، لائف اور اسپورٹنگ ٹائمز کے پرچے الٹنے پلٹنے لگے

وہ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کے آیا اور پھر سے ٹائی باندھنے لگا۔

ولنگڈن سے وہ سب کھانا کھا کے دس بجے کے قریب لوٹے۔ اور ناصر کو رستہ پر اتار دیا۔ ناصر تارا سے لگ کے بیٹھا تھا۔ اور تارا تھی کہ موٹر میں بھاسکر سے پٹتی چلی جاتی تھی۔ ناصر کے اُترنے کے بعد اس نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔

"چلو چاندنی رات ہے۔ قلابہ چلیں۔"

"ڈرائیور نے قلابے کی طرف گاڑی کو موڑا۔

رام لال نے کہا۔ "تم دونوں تو ٹہلنے چلے جاؤ گے۔ میں اکیلا مکھیاں مارتا رہوں گا۔"

"نہیں جی ہم تم کو چھوڑ کے نہیں جائیں گے۔" بھاسکر نے کہا۔

"دادا ہم نے آپ کے لئے ایک ایسی اچھی لڑکی ڈھونڈھی ہے۔" تارا نے کہا۔ اور اس کے ہونٹوں کی سرخی دانتوں کے اطراف اور اس کی بندی کی سرخی پیشانی کی بے نمک سفیدی میں مسکرائی۔ اور رام لال نے محسوس کیا کہ بے نمک سفید پیشانی، اور سرخ بندی، اور ہونٹوں کی لالی اور چمکتے ہوئے دانت سب اس کے اپنے بازو سے پلٹے ہوئے جھولا جھول رہے ہیں۔

دور میلوں تک سمندر پر چاندنی اور دھند میں خاموش سی آویزش تھی۔ یہ سب چور بازار کے سگریٹوں کا دھواں معلوم ہوتا تھا۔ ناریل کے درخت خاموش کھڑے تھے۔ ہوا میں خوشگوار ٹھنڈک تھی۔ اور رام لال نے دو انگلیاں اپنے ہونٹوں

پر رکھ کے بڑی شائستگی سے جماہی کو روکا۔

رات کے گیارہ بجے جب وہ پہنچا تو پھر یہ پیغام لکھا ہوا ملا۔ کہ نمبر ۴۸ ۲۱۷ سے ٹیلیفون آیا۔ ایک اور پیغام میں لکھا تھا۔ کہ دس بجے پھر ٹیلیفون آیا، سیٹھ شیو داسانی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ ان سے کل صبح بات کر سکتے ہیں؟ اور صبح ساڑھے سات بجے اس نے نمبر ملایا ۴ ۸ ۲۱۷۔ ایک زنانہ آواز نے کہا۔ "ہلو" اس نے اپنے دل میں کہا ارونا عرف پیٹریشیا عرف پیٹ۔ پھر کہا "میں سیٹھ شیو داسانی سے بات کر سکتا ہوں؟

"آپ کا نام"

"لال"

"لال؟ کہاں سے؟"

"تاج سے"

"کہاں سے؟" زنانہ آواز نہیں سمجھی۔

"تاج محل ہوٹل سے۔ لال"

"اُوہ مسٹر رام لال"

"جی ہاں۔ آپ ارونا ہیں؟"

"جی نہیں۔ اُرمیلا۔ کیوں کیا آپ ارونا سے بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے سیٹھ شیو داسانی نے ٹیلیفون کیا تھا"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے۔ معلوم ہے۔ میں ابھی ان کو بلاتی ہوں، بلاتی ہوں آپ ذرا ٹھہریئے۔"

اور پھر اس نے آواز سُنی۔ "پا ___ پا"

پھر آواز آئی۔ "پا۔ مسٹر رام لال ٹیلیفون پر ہیں۔"

پھر سیٹھ شیو داسانی کی ہانپتی ہوئی آواز آئی۔ "اوہ ہلو۔ مسٹر رام لال۔ آپ کیسے ہیں۔ میں نے کل بھی ٹیلیفون کیا تھا۔ جی کوئی خاص بات نہیں۔ آج یہاں میرے فلیٹ میں ایک چھوٹی سی پارٹی تھی...... جی بالکل انفارمل۔ بے تکلف سی... آپ آسکیں گے۔"

"ضرور۔" رام لال نے ارونا کو تاج میں ناچتے دیکھا۔ "کتنے بجے؟"

"آٹھ بجے۔ بالکل انفارمل سی۔" پھر سیٹھ شیو داسانی کی آواز میٹھی سی پھنکار بن گئی۔ "میں نے دو تین لڑکیوں کو بلایا ہے۔ ارونا تو ہوگی ہی۔ اس کا منگیتر بھی ہوگا۔ اس کے علاوہ اور بھی...... بالکل انفارمل سی پارٹی جی.. ضرور آنا۔"

"میں ضرور آؤں گا"

"پتہ تو آپ کو یاد ہے نا، راج کنول بھون۔ فلیٹ نمبر ۴ پہلی منزل پر، سمندر کے رُخ...... میرین ڈرائیو پر......"

"جی ہاں آپ کا کارڈ میرے پاس ہے۔"

"تو پھر آپ آئیں گے نا۔ ضرور۔"

"ضرور۔ بہت شکریہ۔"

"ضرور۔"

"بہت شکریہ۔"

رام لال، بھاسکر کی گاڑی میں میرین ڈرائیو چلا۔ راستے ہی میں سکھ شوفر نے کہا کہ ادھر کہیں گوالیا ٹینک کے پاس اس کی بھی کہیں دعوت ہے۔ رام لال نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور سوچا کہ تاج اب یہاں سے کتنی دور ہے۔ واپس میں پیدل ہی چلا آؤں گا۔ راج کنول بھون کے باہر صرف ایک بڑی سی بیوک کھڑی تھی۔ اوپر کی منزل میں ایسی زیادہ روشنی بھی نہ تھی، اور نہ چہل پہل کے کوئی خاص آثار تھے۔ اُسے ذرا حیرت بھی ہوئی۔ چوکیدار نے اسے راستہ بتایا، اور سیڑھیاں چڑھ کے اس نے دائیں طرف گھنٹی کا کھٹکا دبایا۔ ایک منٹ تک انتظار کیا۔ وہ دوبارہ کھٹکا دبانے ہی والا تھا کہ شرٹ سلیور اور کور دورائے کے پتلون میں سیٹھ شیو داسانی کی شکل دروازے کے کواڑ اور دیوار کے درمیان نظر آئی۔ اور ان کی آواز آئی۔ "اوہ مسٹر لال۔ تشریف لائیے تشریف لائیے۔"

معلوم ہوتا تھا کہ کسی سے ٹیلیفون پر باتیں کرتے کرتے وہ دروازہ کھولنے

کے لئے آئے تھے۔ رام لال کو بٹھا کے وہ پھر ٹیلیفون پر باتیں کرنے لگے "تم لوگ نو بجے تک آجانا۔ نو بجے تک۔ ہاں۔ نہیں...... وہی نئی ایکسٹرا لڑکی۔ جی نہیں۔ ایسی تو ہو جو سوسائٹی میں بات چیت کر سکے۔ نہیں تم رہنے دو...... اچھا...... دیکھو نو سے پہلے نہیں۔"

سیٹھ شیو داسانی بیحد گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کیا "پھر معاف کیجیے گا" کہہ کر سگریٹوں کا ڈبہ رام لال کے سامنے رکھا۔ اور کھڑکی کو بھی اچھی طرح بند کر دیا۔

رام لال ذرا پریشان ہو کر یہ سب دیکھ رہا تھا۔ شیو داسانی "پھر معاف کیجیے گا۔ دوسرے مہمان آتے ہی ہوں گے۔" کہہ کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رام لال نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ دیواروں پر ہلکا پینٹ۔ فرش پر بڑے بڑے چکنے چکنے ٹائلز، اور ان پر کم از کم دس ہزار کا بخارا کا قالین۔ نہرے اسپرنگ کے صوفے۔ اخروٹ کی تپائیاں۔ چاندی کے ایش ٹرے۔ ایک دیوار پر ارونا کی قدآدم تصویر۔ اور اس کے سوا اور کئی تصویریں جن میں کسی سے بھی کسی خاص بلند ذوقی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

سیٹھ شیو داسانی پرتگالی برانڈی کا ایک بہت بڑا شیشہ، اور سوڈے کی بوتلیں لئے ہوئے آیا۔ یہ سب میز پر رکھ کے پھر اندر چلا آیا۔ اور ایک چھوٹی سی کشتی میں گلاس لے آیا۔ کہنے لگا، میں نے آج سب نوکروں کو چھٹی دے دی ہے یہ سب آپکو عجیب معلوم ہوتا ہوگا۔ مگر زمانہ نازک ہے۔ اور کسی پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے بڑی شک کی نظروں سے رام لال کی طرف دیکھا۔

رام لال بہت حیران تھا۔ محض اپنے طبعی سکون اور آہستگی کی وجہ سے پریشانی نہ اس نے محسوس کی۔ نہ اس کا اظہار کیا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ سیٹھ شیوداسانی اُسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ مگر یہ بند دروازے کیوں؟ بند کھڑکیاں کیوں؟ اور یقیناً اس نے دوسروں کو نو بجے سے پہلے نہ آنے کے لئے ٹیلیفون کیا تھا۔ رام لال سمجھتا تھا کہ رومان اور راز اور اسرار اور سراغرسانی کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔

سیٹھ شیوداسانی نے دو گلاسوں میں آدھی آدھی برانڈی اُنڈیلی۔ رام لال عموماً چھوٹا پیگ کا عادی تھا۔ مگر اس وقت انکار کو وہ کمزوری سمجھا۔ مگر اپنی رفتار کو بہت ہی کم رکھنے کا فیصلہ کر کے اس نے گلاس اٹھا لیا۔ سیٹھ شیوداسانی جواب ذرا سکون آنکھ کھول کے ایک آنکھ بند کر کے گویا گلاس کو بجلی کی روشنی میں پرکھ کے کہنے لگا "یہ بڑی پرانی برانڈی ہے۔ اس کا میرے پاس بہت بڑا اسٹاک ہے اور میں نے یہ فوج سے خریدی تھی۔ ایسی برانڈی آپ کو بمبئی میں شاید ہی کہیں ملے۔ اچھی سے اچھی ڈیڈرا اسکے سامنے ہیچ ہے..... ہیرس لبسٹ۔"

اچھی سے اچھی ڈیڈرا اس کے سامنے ہیچ ہے...... ہیرس لبسٹ۔"

ہیرس لبسٹ

سیٹھ شیوداسانی نے اسے سگریٹ دیا، اور پھر خود سگریٹ سلگا کے لمبا کش لے کے کہنے لگا۔ "مسٹر لال میں آپ سے دھرم سے کہتا ہوں میں ایماندار آدمی ہوں میں نے دھوکہ دے کے روپیہ نہیں بنایا۔

"بے شک۔ بے شک۔" رام لال نے جواب دیا۔

"آپ کو انکم ٹیکس اور محصول زائد منافع کی شرح تو معلوم ہے نا۔ لاکھوں روپے کماؤ تو آپ کے ہاتھ میں سرکار صرف تھوڑے سے روپے رہنے دیتی ہے۔ اور سب ہضم کر جاتی ہے۔ بتاؤ ہم لوگ کیا کریں۔ روپیہ بنک میں جمع کرایا تو ہاتھ سے گیا۔"

رام لال نے آہستہ آہستہ طنز سے مسکرا کے سگریٹ کا ایک کش لیا۔ اور کہا سیٹھ صاحب آپ کی ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ سرکار نے یہ ہزار روپیہ کے نوٹ والا قصہ تو چور بازار والوں کے لئے اٹھا کھڑا کیا ہے۔"

"مسٹر لال۔ یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" شیو داسانی نے برانڈی ختم کر کے پھر سے آدھا گلاس بھر کر کہا۔ "یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر ہم تو پسے جا رہے ہیں۔ دیکھئے نا۔ میرے کئی دھندے ہیں۔ میں کہتا ہوں میں محنت کرتا ہوں سرکار کو زائد منافع کیوں دوں۔ اور بہرحال اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب تو میرے پاس جتنے نوٹ ہیں۔ وہ بینک میں جمع ہو سکنے سے رہے۔ اب مجھے فکر ہے۔ میں کیا کروں۔"

وہ جلدی جلدی سگریٹ کے کش لینے لگا۔ اس نے پھر سے رام لال کے گلاس میں برانڈی ڈالنی چاہی۔ رام لال نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔

دو تین منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر سیٹھ شیو داسانی دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا۔ اور رام لال کے قریب آ کے اس سے سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ "میں

دس فیصد کمیشن دینے کے لئے تیار ہوں۔"

"کیسا کمیشن؟"

"دیکھئے نا آپ آنند نگر کے رہنے والے ہیں۔ وہاں فنانس سکرٹری ہیں۔ آپ کا اثر ہے۔ ابھی ریاستوں میں اس قانون کی پابندی نہیں ہوئی۔ آپ چاہیں تو میری بڑی مدد کر سکتے ہیں۔"

رام لال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے سگریٹ کے ہلکے ہلکے دو تین کش لئے پھر مسکرایا۔ اور کہنے لگا۔ دیکھئے سیٹھ صاحب میں زیادہ امیر تو نہیں۔ مگر بھگوان کی کرپا سے اچھی خاصی جائداد ہے۔ اور میں نے اب تک کبھی بد دیانتی نہیں کی۔ اس کے علاوہ مجھے بلیک مارکٹ کرنے والوں سے زیادہ ہمدردی بھی نہیں۔"

اس کا خیال تھا کہ یہ جواب سیٹھ شیوداسانی کو خاموش کر دے گا۔ کھڑکی کے پٹ کھل جائیں گے۔ اور یہ کاروباری گفتگو برانڈی کے گلاس میں تحلیل ہو جائیگی۔

"میں نے آپ کو دس فیصد دینے کا آفر کیا ہے۔ اس وقت بازار میں چار فیصد سے زیادہ کمیشن پر کوئی نوٹ نہیں بیچ رہا ہے۔ اور میں کچھ دس پانچ نوٹ آپ کو نہیں بیچ رہا ہوں ـــــ تیس لاکھ کے نوٹ۔"

"کتنے؟" رام لال کی ساری متانت اور آہستگی رخصت ہو گئی۔

"تیس لاکھ۔ دس، بیس، تیس لاکھ۔ جن کا کمیشن دس فیصد کے حساب سے تین لاکھ ہوا تین لاکھ مفت میں۔ رام لال جی ذرا ہوش کی دوا کرو۔ روز روز ایسا

سستا پیسہ نہیں ملتا۔ آپ کو میں نے محض اس لئے بلایا ہے کہ ایک دم معاملہ طے ہو جائے"۔

"تین لاکھ" اور رام لال کی سانس گلے میں گھٹ کے رہ گئی۔ اس کے چہرے پر وہ چمک آئی جو کسی دوشیزہ پر بدکاری کی پہلی ترغیب انگیز دعوت کے ساتھ آتی ہے اور اور اس سے پوچھے بغیر سیٹھ شیوداسانی نے پھر آدھا گلاس برانڈی انڈیل کے سوڈا ملا کے اس کے آگے بڑھا دی۔

اس نے بجائے آہستہ آہستہ پینے کے ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے اتارا۔ اس طرح نہیں جیسے کوئی محبوبہ کا ہلکا سا پیار لے، اس طرح جیسے کوئی کسی قحبہ کے گال میں کاٹ کھائے۔ اور سیٹھ شیوداسانی نے دیکھ لیا کہ منتر قریب قریب چل گیا۔

کامیابی کی امید بندھی تو شیوداسانی نے ایک اور وار کیا۔ "لڑکیاں آتی ہی ہونگی۔ آپ سے باتیں کرنا تھیں۔ اس لئے میں نے انہیں ذرا دیر میں آنے کو کہا"۔

"کون لڑکیاں؟" "دو تو وہی جن کو آپ دیکھ چکے ہیں۔ ارونا اور ارمیلا۔ ارونا تو اڑتی ہوئی ناگن ہے۔ دو نئی لڑکیاں ہیں"۔ پھر اس نے کہا۔ "اجی رام لال جی۔ ہم جانتے ہیں تم جوان آدمی ہو، اب ہمارے بال سفید ہو رہے ہیں۔ تمہارے ہیں موج کرنے کے دن"۔

"تیس لاکھ۔" رام لال اب تک اس رقم کو برانڈی کے گلاس میں غرق نہیں کر پایا تھا۔ "سیٹھ صاحب آپ نے اتنے روپے کمائے کیسے؟ فلم کے کاروبار میں اتنی آمدنی ہے"۔

"یقین نہ ہو تو ادھر آیئے۔" سیٹھ شیو داسانی نے دوسرے کمرے میں بجلی کا بٹن دبایا۔ ایک بظاہر بڑی معمولی سی الماری کو کھولا۔ اس میں قدِ آدم آہنی تجوری تھی۔ تجوری اور رام لال کے درمیان کھڑا ہو کے اس نے پیچدار نمبروں کو گھمایا۔ دونوں آہنی پٹ کھلے، اور اس نے ہزار ہزار روپیوں کے نوٹوں کے بنڈل کے بنڈل۔ بیسیوں بنڈل نکال نکال کے رام لال کو دکھانا شروع کیے۔ اور پھر اسی طرح ان کو رکھ کے رام لال اور تجوری کے درمیان حائل ہو کے تجوری بند کی۔ الماری بند کی اور کہا۔

"رام لال جی۔ اس میں سے تین لاکھ تمہارے۔"

رام لال کچھ جواب دیئے بغیر آ کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا یہ کاغذ کے سینکڑوں پرزے۔ ان میں اتنی طاقت ہے کہ موٹروں کے انجن ان کے حکم سے دھڑکیں ان کے اعجاز سے سر بفلک عمارتیں کھڑی ہو جائیں، ان کے طلسم سے ہزارہا مزدور اور کاریگر صبح سے شام تک کام کریں، ان کے سحر سے حسین سے حسین عورتوں کے ریشمیں ملبوس اتر جائیں، اور ان کے جسم تھرے اسپرنگ والے صوفوں پہ اسی بجلی کی روشنی کی عریانی میں چمکنے لگیں۔ پھر سے اس کی آہستہ روی، متانت، آہستگی عود کر آئی۔ اب کے پھر برانڈی کا گلاس اس نے اس طرح منہ سے لگایا جیسے کوئی اپنی باعصمت محبوبہ کی کالی مخملیں زلفوں کا بوسہ لے۔

پھر آہستہ آہستہ اس نے کہا۔ "سیٹھ صاحب۔ میں بھگوان کی قسم کھا کے آپ سے اتنا تو وعدہ کر سکتا ہوں کہ آج آپ نے جو باتیں مجھ سے کیں ان کا ذکر میں کسی سے

نہیں کروں گا۔ آپ اپنے مختار ہیں۔ مگر میری پندرہ سال کی نوکری ہونے کو آئی ہے۔ اب تک بہت دیانت سے میں نے عمر بسر کی ہے۔ مجھے معاف کیجئے۔"

"جیسی آپ کی مرضی" سیٹھ جی نے اب پھر سے اپنے گلاس میں برانڈی انڈیل کے اور سوڈا ملا کے کہا۔ اور پھر رام لال کی طرف دیکھ کے وہ ذرا ہنسے "رام لال جی آپ بیکار ڈرتے ہیں۔ سب انتظام میں کروں گا۔ آپ کے اثر کی ضرورت ہے۔"

رام لال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں ارونا کی قدِ آدم تصویر پر لگی ہوئی تھیں۔

شیو داسانی نے کہا "کیسی سندر لڑکی ہے۔"

"ہاں بہت خوبصورت ہے۔"

"آپ کو پسند ہے؟"

رام لال ہنسا۔ گویا اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس نے بات بدلنے کے لئے پوچھا "سیٹھ جی یہ سب روپیہ آپ نے فلموں میں کمایا۔"

"زیادہ تر فلموں میں۔ دیکھئے نا مزدور آجکل جنگ کے زمانے میں ڈیڑھ روپیہ کے قریب کما لیتا ہے۔ ہفتے میں دو بار تو وہ خود آ کے سینما دیکھ لیتا ہے۔ میں نے سوچا کہ ایسے فلم کیوں نہ بنواؤں جس میں یہی مزدوروں، نیشنلزم، سوشلزم، بھارت ماتا وغیرہ کا ذکر ہو۔ اجی مسٹر لال قومی خدمت بھی ہو۔ اور اپنا کام بھی پورا ہو۔ میں نے سوچا۔ کہ ذرا تھوڑی بہت پڑھی لکھی ایکٹرسیں نوکر رکھوں۔ اور جی فلم کی کہانی لکھنے کے لئے میں

نے ایک مشہور ترقی پسند ادیب کو نوکر رکھا۔ ان کو مزدوروں سے بہت ہمدردی ہے۔ مگر آج کل ٹیکسیوں میں پھرتے ہیں۔ میں انہیں ڈیڑھ ہزار روپے تنخواہ دیتا ہوں۔ وہ دو سو روپیہ مہینے مکان کا کرایہ دیتے ہیں۔ اور ایک ایکٹرس کو رکھ چھوڑا ہے۔ جعفری اس کا نام ہے...... خیر جی ہمیں اس سے کیا تو جناب مزدور سینما دیکھیں۔ سوشلزم کا پرچار ہو۔ مگر ٹکے ہمیں مل جائیں۔ اور کیا چاہیئے۔"

"سینما کے علاوہ آپ اور کوئی کاروبار نہیں کرتے؟"

"کوئی خاص کاروبار بڑے پیمانے پر تو نہیں۔ چھوٹے موٹے دھندے کئی ہیں۔ مثلاً جب جنگ شروع ہوئی تو میں نے کہا اب جرمن دوائیں تو نہیں آنے کی۔ میں نے بمبئی کے ہر کیمسٹ کی دوکان سے پھر پھر کے دوائیاں خرید لیں۔ اس میں کوئی دس بیس لاکھ بنا لئے۔ اب چھوڑیئے ان باتوں کو۔ تو یہ کہیئے ارونا آپ کو پسند ہے۔"

"آپ تو مذاق کر رہے ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔"

"نہیں جی آپ جوان آدمی ہیں۔ دیکھئے میں نے اور بھی لڑکیاں بلوائی ہیں۔ اب وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ سن لیجیئے۔ میں ایک ہوائی جہاز چارٹر کرتا ہوں پوراڈیکوٹا۔ آپ کے اننگر میں فوجی ایروڈروم تو ہے نا۔ وہاں ہم تینوں ساتھ چلیں گے آپ اور میں اور ارونا۔ اور یہ سامان بھی پہنچ ہی جائے گا۔ پھر آپ......

اور قبل اس کے کہ رام لال کوئی جواب دے۔ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ سیٹھ شیوداسانی نے پہلے لپک کے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ اور سمندر کی طرف

سے خنک ہوا کا ایک ناگوار جھونکا آیا۔

اتنے میں پھر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اور کسی نے گہری آواز میں لفظ کو کھینچ کر کہا۔ "پا آ آ"

"آیا۔ آیا!" کہہ کے سیٹھ شیو داسانی نے دروازہ کھولا۔ دروازے کے سامنے "سرطان زدہ" نوجوان آر۔ اے۔ ایف کی وردی میں کھڑا تھا۔ اور اس کے پیچھے ساڑیوں میں، چمکتی ہوئی، مادھو داس رگھوناتھ داس کی شاہکار سنہرے کام کی ساڑیوں میں لپٹی ہوئی، جگمگاتی ہوئی دونوں اینگلو انڈین ایکٹرسیں کھڑی تھیں۔

"سرطان زدہ نوجوان نے وہیں سے اپنا چوڑا چکلا دہانہ پھیلا کے الیسٹ اینڈ کی شستہ ترین کاکنی میں اے کو ایچ اور ایچ کو اے بنا کے کہا۔ "پا۔ پا۔ پا تم کو دیکھ کے مجھے شرم آتی ہے۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے دروازے کے دونوں طرف رکھے اور کہا۔ "پا۔ تم پی رہے تھے نا۔ خوب پی رہے تھے..... پا تم کو دیکھ کے مجھے شرم آتی ہے۔ پیٹ، ڈارلنگ پیٹ، پا کو دیکھو ساری برانڈی پی گئے۔ اور پھر رام لال سے مخاطب ہو کے اس نے پوچھا۔ "کیوں مسٹر لال اس ہمارے پا نے کتنی بوتلیں پی ڈالیں۔

"صرف تین چار گلاس۔" رام لال نے کہا۔ لڑکیاں مسکرائیں، وہ ان کے جواب میں مسکرایا، اور اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

ارمیلا نے کہا۔ "جو ہمیں اندر تو جانے دو۔" اور دونوں لڑکیاں جو کے

ہاتھوں کے نیچے سے جھک کر اندر آ گئیں۔"

"یہ دوسروں کے گھر میں زبردستی گھسنا ہے۔ پیٹ مجھے تم کو دیکھ کے شرم آتی ہے۔ تم پا سے بدتر ہو۔ کیوں مسٹر لال؟"

رام لال ہنسا اور اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

آپ صرف ہنس رہے ہیں اور جواب نہیں دیتے۔" سرطان زدہ کا کنی نوجوان نے پھر اپنے چوڑے دہانے کے اندر سے چوڑے چوڑے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے، انگلی سے اسے دھمکاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر لال آپ سچے ہیں۔ مگر دیانت دار نہیں۔"

سیٹھ شیو داسانی نے کہا۔" اور تم جو۔ جو تم دیانت دار ہو۔ مگر سچے نہیں ہو۔"

دونوں اینگلو انڈین ایکٹرسوں نے ہنس کے ایک ساتھ کہا۔ "ہاں تم دیانت دار ہو مگر سچے نہیں ہو۔"

"وہ کیسے پا۔ وہ کیسے پیٹ۔ وہ کیسے ڈک۔ میں چاہتا ہوں تم فوراً فوراً فوراً بتاؤ۔ وہ کیسے؟"

"مثلاً تم خود ابھی ریڈیو کلب میں پورا ایک بوتل وہائٹ ہارس پی کے آئے ہو۔" ڈکسی (اُرمیلا) نے کہا۔

"مثلاً تم کو اتنا بھی ہوش نہیں کہ تم سر کے بل کھڑے ہو یا پیروں کے بل —" شیو داسانی نے کہا۔

سرطان زدہ" نوجوان نے جھک کے اپنے پیر چھوئے اور کہا۔" یہ ہیں میرے پیر۔" اپنا سر چھوا اور کہا۔" یہ ہے میرا سر۔ میں پیر کے بل کھڑا ہوں۔ پیٹ ڈارلنگ پا دیانت دار ہیں مگر سچے نہیں۔"

رام لال جو اسی متانت سے اس عجیب مجمع میں کھڑا تھا، اپنے دل میں کہنے لگا۔ یہ سرطان زدہ کا کنی ایسا برا نہیں۔ میں بھی اسے جو کہا کروں گا۔

محض بات کرنے کی خاطر مسکرا کے اس نے کہا۔" ہاں جو۔ میں گواہی دیتا ہوں، تم سچے بھی ہو۔ دیانت دار بھی۔"

جو دروازے سے آگے بڑھ آیا، اور صوفے کے دستے پر بیٹھ گیا۔" دیکھا پا۔ آخر مجھے ایک دوست مل گیا۔ لاؤ دوست اپنا ہاتھ دو...... ایک ہاتھ میں اس نے رام لال کا ہاتھ لیا۔ یہ ہیں نے ڈیوک آف ونڈسر ـــــ معاف کرنا ایڈورڈ ہشتم سے بھی کہا تھا۔ ہی از اے جالی گڈ فیلو۔ فار ہی از اے جالی گڈ فیلو۔"

"پا۔" ارونا نے سیٹھ شیوداسانی کو کھینچ کے اپنے پاس بٹھالیا۔" پا۔ جو نے ریڈیو کلب میں پوری ایک بوتل وہسکی پی ہے۔ وہائٹ ہارس۔"

اسی لئے تو نشے میں جھوم رہا ہے۔" سیٹھ شیوداسانی نے کہا۔

"نشہ؟ نشہ؟ میری طرف دیکھو ڈارلنگ۔ پیٹ ڈارلنگ۔ میری آنکھوں کی طرف دیکھو۔ بھلا میری آنکھوں میں نشہ ہے۔ اور اگر ہے بھی تو مسٹر لال میں نے سوڈے کی دس بوتلیں پئیں۔ سوڈے کی دس بوتلیں۔ اس میں تھوڑی سی وسکی بھی

تھی مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"آ۔ آ۔ آ۔" پیٹ ڈارلنگ (ارونا) نے کہا۔

"آ۔ آ۔ آ" اُرمیلا نے انگلی نچا کے دھمکی دی۔

"تم سچے ہو مگر دیانت دار نہیں ہو۔" ارونا نے کہا۔

"تم دیانت دار ہو مگر سچے نہیں ہو۔" سیٹھ شیو داسانی نے کہا۔

شیو داسانی نے دفعتاً اُرمیلا سے پوچھا۔ "وہ دونوں لڑکیاں نہیں آئیں؟"

"لڑکیاں۔ لڑکیاں۔ لڑکیاں۔ پا تم کو دیکھ کر مجھے شرم آتی ہے۔ جو نے کہا۔ "دیکھو تمہارے سر کے بال تو سب سفید ہو گئے ہیں۔ کیوں مسٹر لال؟"

اُرمیلا نے شیو داسانی سے کہا۔ "وہ جعفری تو سینو ریو رائٹر کے ساتھ وار سوا گئی ہے اور اوشا معلوم نہیں کہاں مر گئی۔

شیو داسانی نے ایک تیز نظر رام لال پر ڈالی، جو ارونا کے شفاف بازوؤں پر پاؤڈر کی چمک سے مسحور سا تھا۔

پھر ارمیلا، اور ارونا ہاٹ کیس سے کھانا نکال کے لائیں۔ بے تکلف سا سپر تھا مرغ پلاؤ۔ نرگسی کوفتے، دو تین طرح کا سلاد، روسٹ چکن، گولڈن پڈنگ، کالی کافی۔

اور بڑے مزے سے باتیں ہوتی رہیں جو کل واپس جا رہا تھا۔ اور یہ بمبئی میں اس کی آخری رات تھی۔ ایک پوری وہائٹ ہارس کی بوتل نے ظرافت کے تمام طبق اس پر روشن کر دیئے اس کے کاکٹیل لہجے میں ایسے ادبی لطیفے جنم لے رہے تھے۔

کہ رام لال کو افسوس ہوا کاش وہ اپنی نوٹ بک میں ان لطیفوں کو لکھ لیتا۔

ساڑھے دس بجے پارٹی ختم ہوئی۔ جو نے کہا "مجھے چرچ گیٹ سے ٹرین مل جائے گی۔" لیکن سیٹھ شیوداسانی نے اپنی جیب سے سوگیلن کے کوپنوں کی کتاب نکال کے ہوا میں لہرائی۔ چور بازار کا معجزہ۔ اور کہا۔ "یہ کوپن کس لئے ہیں؟"

رام لال نے اجازت چاہی تو سیٹھ صاحب نے کہا۔ "آپ سے پوری گفتگو ہو ہی نہیں سکی۔ ابھی ایسی جلدی کیا ہے۔ آپ اپنی گاڑی میں آئے ہیں؟"

"نہیں میں اپنے ایک دوست کی گاڑی میں آیا تھا۔ میں نے گاڑی واپس کر دی ہے۔ تاج کتنی دور ہے۔ ٹہلتا ہوا چلا جاؤں گا۔"

"نہیں مسٹر لال یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر آپ کو نیند نہ آ رہی ہو تو چلئے۔ پہلے جو کو ورلی تک چھوڑ آئیں۔ چاندنی رات ہے۔ بڑے مزے کا ڈرائیو ہے۔ پھر میں آپ کو تاج پہنچا آؤں گا۔"

رام لال تیار ہو گیا۔ جو نے ارونا کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے ساتھ بیوک میں اندر بٹھا لیا۔ شیوداسانی نے اسٹیرنگ وہیل سنبھالا اور رام لال اس کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ بیوک نیلے اور کالے رنگ کی تھی۔ اور چاندنی میں بالکل نیلم پری معلوم ہوتی تھی۔ سمندر پر چاندنی میں گھلی ہوئی دھند دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔ بالکل چور بازار کے امریکن سگریٹوں کے دھوئیں کی طرح۔ اور ادھر دور ماہی گیروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے بادبان۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے اس دھند پر تصویر کی طرح چپکا دیئے ہیں

میرین ڈرائیو پر اچھی موٹریں کافی تعداد میں آجا رہی تھیں۔ کچھ جوڑے بنچوں پر بیٹھے عاشقی کر رہے تھے۔ کچھ میاں بیوی، انگریز، گجراتی، اجنبی مسلمان، پارسی ہاتھ میں ہاتھ دیئے تیز تیز ٹہل رہے تھے۔ کنارے کی منڈیر پر کچھ کمیونسٹ بیٹھے غالباً سندھ اسمبلی کے انتخابات اور جی۔ ایم سید کے مستقبل کے متعلق رائے زنی کر رہے ہوں گے۔

سیدھے ہاتھ کی عمارتیں، دیووں کے گھروندے ختم ہوئے۔ میدان آیا۔ اس پار بی بی اینڈ سی آئی کی لوکل چلی جا رہی تھی۔ چوپاٹی آئی۔ موٹر نے ہارن دیا۔ کتراتی عمارتوں کے ہجوم میں سے ہوتی ہوئی وارڈن روڈ پر بھولا بھائی ڈیسائی کے مکان کے سامنے جا نکلی۔ آگے بڑھی اور تیز تیز۔

رام لال نے سنجیدگی اور آہستگی سے سر کو ذرا پلٹا کے دیکھا۔ ارونا جو کے آغوش میں گال سے گال لگائے چپکی بیٹھی تھی۔ رام لال پھر سامنے روشنیوں کی قطار کو دیکھنے لگا جو صف بستہ باڈی گارڈ کی طرح بیوک کی تیز روشنی کو سلام کرتی ہوئی گذر جاتیں۔ اور ورلی میں آر۔ اے۔ ایف کے کیمپ کے قریب اس نے دفعتاً بریک دبایا۔ او انجن کو خاموش کر دیا۔

ایک طویل بوسے کے بعد جو ارونا کو چھوڑ کے نیچے اترا۔ اس کی ساری ظرافت ختم ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں اس نے ارونا کے کان میں کیا آخری پیغام محبت دیا تھا۔

سیٹھ شیوداسانی نے گاڑی موڑی۔ جو جا چکا تھا۔ اس نے ارونا سے کہا۔

"تم سامنے ہم لوگوں کے ساتھ آجاؤ۔"

ارونا نے آہستہ سے انکار میں سر ہلایا۔ اور رام لال نے اس سر ہلانے کے انداز میں دیکھ لیا کہ اس پر اس الوداعی بوسے کا سحر سا طاری ہے۔ اس لئے جب شیو داسانی نے اس سے پیچھے کی نشست پر جا بیٹھنے کو کہا تو اس نے بھی انکار کر دیا۔

دہلی گذر جانے پر سیٹھ شیو داسانی نے کہا: "کل ہوائی جہاز تیار رہے گا۔"

"میں بالکل مجبور ہوں۔" رام لال نے جواب دیا۔

"آپ قطعاً مجبور نہیں۔" سیٹھ شیو داسانی نے کہا۔ "آدمی کو دنیا میں عملی بننا چاہیئے۔"

رام لال نے پھر اسی آہستہ روی، متانت، آہستگی سے کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ ارونا کی طرف۔ اپنے منگیتر سے رخصت اور الوداع کا طلسم اس پر اسی طرح طاری تھا۔ وہ بالکل بے خبر، عشق کی چادر میں ملفوف چاندنی کی چادر سے غافل، بہی چلی جا رہی تھی۔

رام لال نے انکار میں سر ہلایا۔ "ناممکن"

سیٹھ شیو داسانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر میرین ڈرائیو آ گئی۔ اس نے کہا۔ "مسٹر لال ابھی تو گیارہ بجے ہیں۔ ہم آپ کو اتنی جلدی نہ جانے دیں گے۔ میرے پاس بڑی اعلیٰ درجے کی کریم دے مانذ آئی ہے۔ ایسی کہ رجواڑوں میں بھی کہیں نہ ہو۔ اس کے دو ایک گلاس تو پی لیجئے۔ اور دیکھئے رات ابھی جوان ہے۔"

رام لال نے کہا۔ "نہیں سیٹھ جی، پھر کبھی، اب تو مجھے تاج ہی پہنچا دیجیے۔"

"نہیں ہم آپ کو اتنی جلدی نہ جانے دیں گے، کیوں ارونا؟"
جیسے کسی نے زبردستی طلسمات کا دروازہ کھول دیا ہو نقشِ سلیمانی پر ہاتھ مارا ہو۔ وہ چونک پڑی۔ "کیا۔ پا"
میں نے کہا۔ ہم اتنی جلدی مسٹر لال کو نہ جانے دیں گے۔"
"ہاں ہرگز نہیں۔" اس نے اخلاق سے کہا اور پھر اپنے اطراف طلسمات کا حصار باندھ لیا۔

پھر اپنے فلیٹ واپس پہنچ کے سیٹھ شیو داسانی نے کہا۔ "مسٹر لال اگر آپ ہاتھ دھونا چاہتے ہوں تو اس خواب گاہ کی طرف۔ ادھر آگے باتھ روم ہے"
جب وہ پھر خواب گاہ کی طرف واپس آیا۔ تو بلا ارادہ آئینہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور جیب سے کنگھی نکال کے اپنے بال ٹھیک کرنے لگا۔
اس نے کسی کو سسکی لیتے سنا۔ درد و کرب کے عالم میں اور ارونا کی آواز دوسرے کمرے سے سنائی دی۔ "نہیں پا۔ آج تو جو رخصت ہوا ہے۔ آج نہیں"
"تو کیا تم چاہتی ہو میں تباہ ہو جاؤں۔ تم خود تباہ ہو جاؤ۔ ڈکسی تباہ ہو جائے۔ جو سے شادی کر لینا۔ یہ لال تم سے شادی کب کر رہا ہے ...... جاؤ"
تین چار منٹ بعد کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے کہا۔ "پلیز کم اِن"۔ ارونا ہاتھ میں کریم دے مانتھ کے دو گلاس لئے ہوئے آئی۔ رام لال نے اس کے

چہرے پر وہی مسکراہٹ دیکھی۔ وہی قلابازیوں والی ازلی ابدی جھوٹی مسکراہٹ۔
پھر اس نے ٹیلیفون پر سیٹھ شیوداسانی کی آواز سنی۔ "کاکا ایرویز۔ ہلو۔ ہلو۔ کل میں نے جس ڈیکوٹا کو ریزرو کرنے کا آرڈر دیا تھا۔ آنند نگر جانے کے لئے۔ ہاں وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم صبح ساڑھے چھ بجے جوہو ایروڈروم پہنچ جائیں گے۔ بالکل ٹھیک۔"
قلابازیوں والی ازلی ابدی جھوٹی مسکراہٹ۔ دراز قد، سڈول، صحت مند۔ تم سچے ہو مگر دیانت دار نہیں۔ تم دیانت دار ہو مگر سچے نہیں۔ میرے دوست تم سچے نہیں، دیانت دار نہیں۔ کریم دے مانڈ۔ مسکراہٹ کی دانتوں میں، ہونٹوں میں قلابازیاں، تین لاکھ۔ کس نے طلسمات کی لوح کو چند منٹ میں ریزہ ریزہ کر دیا۔ کس نے نقش سلیمانی کو بگاڑ دیا۔ کس نے اُس جن کو جو سمندر کی تہ میں ایک بوتل میں دفن تھا، آزاد کر دیا۔ اور وہ سمندر پر دھند کے مینار کی طرح چھا گیا۔ جیسے چور بازار کے امریکن سگریٹوں کا دھواں
اور رام لال نے ازلی ابدی جھوٹی مسکراہٹ سے کہا "تم آج بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی ہو۔"
"تھینک یُو۔"
اور اس نے دونوں ہاتھوں میں سڈول، صحت مند رخساروں کو تھام لیا۔ مسکراہٹ ہی مسکراہٹ تھی۔ ازلی، ابدی، ہزاروں کے نوٹوں کی جتنی قیمت۔ طلسمات کا دور دور کہیں پتہ نہ تھا۔ ایک آنسو تک مسکراہٹ نے پاس نہ پھٹکنے دیا۔ اور رام لال نے بڑی متانت، سنجیدگی، آہستگی سے ارونا کے سرخ صحت مند ہونٹوں کو چوم لیا۔

جھوٹا خواب

کہتے ہیں پہلے یہ میز کا برقی پنکھا تھا، بڑھتے بڑھتے جنگی جہاز بن گیا۔ اس کا رنگ سرمئی تھا، اور اب تک اس کے نچلے حصے پر آنکھ کی ایک بڑی سی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کا جاپانی نام کسی سے پڑھا نہ جاتا تھا اس لئے سورابیا میں سب اسے "آنکھ مارو" کہا کرتے تھے۔

میرے جاوی میزبان نے جس کی کشتی میں میں اس جہاز کی طرف جا رہا تھا، مجھ سے کہا۔ "جاپانی اس جہاز کو اسی طرح چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔ اب اس میں صرف ہماری سردار زادی اور اس کا اسٹاف رہتا ہے۔"

سردار زادی کو اخبار نویسوں کی ملاقات سے کوئی خاص نفرت نہ تھی۔ مگر اسے باہر ڈاکٹر سوئیکارنو کی کسی کانفرنس میں شریک ہونے جانا تھا، پھر بھی اس نے کہا کہ

، وہ مجھے ایک دو منٹ وقت دے سکے گی۔ وہ جب برآمد ہوئی تو گہرے چاکلیٹ کے رنگ کا چینی تراش کا فراک پہنے تھی۔ مجھے جیسی توقع تھی وہ کچھ ایسی ہی تھی، یعنی پرل بک کے ناولوں کے امریکی فلموں میں لوئی رائنر اور کیتھرین ہیپ برن کے ایک عجیب امتزاج کا نمونہ۔ اس کی آنکھوں کی تراش چینی تھی اور لبوں کی تراش ہندوستانی اس وجہ سے کبھی کبھی وہ ایسی تعلیم یافتہ ہندوستانی لڑکی معلوم ہوتی جو فیشن ایبل تو بہت ہو مگر جس کو اب بھی بزرگوں کی موجودگی میں سر پہ ساڑی کا پلّو بار بار ٹھیک کر لینے کی عادت ہو۔

مجھ سے ہاتھ ملا کر وہ کہنے لگی۔ "غالباً مسٹر جہازی؟ مسٹر جہازی میں بڑی خوشی سے آپ کو تفصیلی ملاقات اور سوالات کا موقع دیتی۔ مگر حالات ذرا نازک ہیں۔ مجھے جمہوریت کے صدر سے ملنے جانا ہے۔ ممکن ہے کہ جاپانیوں کا تخلیہ کرانے کے بہانے برطانوی فوجیں بہت جلد اُتر جائیں۔ میں دو تین گھنٹے کے اندر واپس آجاؤں گی۔ اگر آپ انتظار کر سکیں تو ......"

میں، سند باد جہازی، رائٹر کا نمائندہ، سر کے خم سے اس کا شکریہ ادا کر کے مسکرانے لگا۔ میں ضرور اس کا انتظار کروں گا۔

وہی موٹر بوٹ جو مجھے اس جنگی جہاز "آنکھ مارو" تک لائی تھی، سردار زادی کو دور چمکتے ہوئے خاکی ساحل کی طرف لے گئی، جہاں سوُرابیا کی آبادی تھی، اور میرا جاوی میزبان بھی پُر اسرار ملاح کی طرح اس کے ساتھ غائب ہو گیا۔ صرف سردار زادی

کے لباس کی بھینی مدھم خوشبو باقی رہ گئی۔ جو بارش سے نم زمین میں کھلتے ہوئے پھولوں کی خوشبو کی سی تھی۔

اس کو جا کے ابھی ایک ہی گھنٹہ ہوا تھا کہ قریب کے ایک برطانوی جنگی جہاز سے ایک فوجی کشتی "آنکھ مارو" کی طرف آئی۔ نائب امیرالبحر کے سفید یونیفارم کو میں نے پہچان لیا، آپ سب نے پہچان لیا۔

نائب امیرالبحر نے کوموڈور کے ساتھ پورے جہاز کا ایک چکر لگایا۔ "فی الحال اس کو یہیں لنگر انداز رہنے دیں گے۔ میں نے ایک بات سوچی ہے۔ یہ میرے ہیڈکوارٹرز بننے کے کام آسکتا ہے۔ کیوں کوموڈور......"

کوموڈور جونز، عہدِ الزبتھ کا ملّاح، جس نے سروالٹر ریلے کے ساتھ بحرِ اوقیانوس کو کھنگال ڈالا تھا، جس نے کیپٹن کک کے ساتھ آسٹریلیا کا سفر کیا تھا، ایک معمولی ملّاح کی طرح کہنے لگا۔ "آئی۔ آئی۔ سر۔"

ہمارے جہاز سے میرا اور اپنا سامان منگوالو۔"

"آئی۔ آئی۔ سر"

اور جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو۔ آٹھ انچ والی توپیں بڑی اچھی حالت میں ہیں۔ میں جنرل کرسٹی سن سے پوچھوں گا۔ ممکن ہے ضرورت پیش آئے۔ کچھ ہندایشیائی اور جاوی جہاز پر ہیں۔ جن کی ضرورت ہے انہیں رہنے دو۔ جو خطرناک ہیں، انہیں ساحل پر پہنچا دو یا قید کر دو۔"

"آئی۔ آئی۔ سر"

"اور پھر دفعتاً اپنی چھوٹی سی عینک کو اپنی ناک پر چڑھا کے اور اوپر سے نیچے تک مجھے دیکھ کے نائب امیر البحر نے سوال کیا۔" اور آخر تم کون ہو؟"

"سندباد جہازی"

"کیا خرافات؟"

"رائٹر کا ہندوستانی نمائندہ جس کی گردن نے پیرِ تسمہ پا کا بوجھ سہارا جس نے مقناطیس کے پہاڑ کو دریافت کیا، اور جو اژدہوں کی وادی سے زندہ سلامت واپس آیا۔"

نائب امیر البحر نے کوموڈور جونز سے کہا۔ "ممکن ہے یہ شخص کارآمد ثابت ہو۔ ہندوستان نے اس جنگ میں دو ہی طرح کے اسلحہ سے ہماری مدد کی ہے — گورکھا سپاہی اور انفارمیشن افسر۔ ایک جان بیچتا ہے، دوسرا ایمان۔ اس کو ایک ریڈیو سٹ، ایک قلم، کچھ کاغذ، کچھ تار کے فارم دے دو۔"

"آئی۔ آئی۔ سر"

اور امیر البحر چلا گیا۔ پھر دو گھنٹے ہو گئے۔ تین گھنٹے ہو گئے۔ اور میں ڈرنے لگا کہ کہیں سردار زادی واپس نہ آجائے۔ وہ ایک بار اگر ان منشورِ اوقیانوس والوں کے ہاتھ پھنس جائے تو پھر اس کا ان کے چنگل سے نکلنا ناممکن ہے۔

اس رات مجھے نائب امیر البحر اور کوموڈور کے ساتھ ایک ہی میز پہ کھانے کی

عزّت بخشی گئی۔ نائب امیر البحر، قدامت پسند، شریف اور بڑا ہی کم سخن آدمی تھا۔ کوموڈور جونز کا لہجہ کاکنی تھا۔ وہ بھی بات چیت ذرا کم ہی کرتا تھا۔ اس لئے میں ہی بکواس کرتا رہا۔

جزیرے کی کیا حالت ہے؟"

کوموڈور جونز نے کہا۔ "یہ دنیا کے متموّل ترین جزیروں میں سے ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ ربڑ اور سب سے زیادہ کونین ......"

نائب امیر البحر آہستہ سے کھنکھارنے لگا۔ اور کوموڈور جونز خاموش ہو گیا۔

اور پھر نائب امیر البحر نے کہا۔ "ہمیں اس جزیرے کی معاشیات اور سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہیں، ہم صرف جاپانیوں کا یہاں سے تخلیہ کرانے آئے ہیں..... مسٹر جہازی کیا خبریں ہیں؟"

"خبریں؟ ایک خبر بڑی اہم ہے۔ ہمالیہ، قراقرم اور ٹان شان کے شمال میں ریچھ اپنے زخموں کو چاٹ رہا ہے، اور دو لق لق ایک کی گردن، دوسرے کی گردن میں حمائل، آسمان پر، اس کے سر پر اڑ رہے ہیں اور ان کی چونچوں میں ایک تھیلی کے دو ڈور، اور ایک تھیلی میں ایک طاقتور ذرّہ ہے، جس میں وہ طاقت اور وہ آگ ہے جس سے آفتاب اپنی قوت حاصل کرتا ہے۔ اور امن کے پیغامبر، یہ لق لق کہہ رہے ہیں کہ اس تھیلی کا منہ بند رکھنا چاہیئے۔ ہم اس تھیلی کی دونوں ڈوریاں اپنی ہی چونچوں میں رکھیں گے ......"

نائب امیر البحر کھانا ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا حضرات چکن الاترک بڑے مزے کا تھا۔ مجھے کچھ کام ہے۔ کافی میں اپنے کیبن میں پیوں گا۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ سر" کوموڈور جونز نے کہا۔ اور پھر میں اور وہ چاندنی رات میں ٹہلنے لگے۔ یہاں تک کہ ایک دن گذرا، دو دن گذرے کئی دن گذر گئے اور سردار زادی واپس نہیں آئی۔ اور کبھی میرا ریڈیو اور کبھی کوموڈور جونز مجھے گورکھوں اور جاوا والوں میں جھڑپوں کے قصے سناتے اور میں ٹائمز آف انڈیا، اور اسٹیٹسمین اور اسی قسم کے دوسرے اخبارات کو خبریں بھیجتا۔ میں لکھتا:۔

"سورابیا۔ فلاں تاریخ۔ انڈونیشیا کے اور برطانوی سپاہیوں میں جھڑپ ہوئی۔ اب جاپانی سپاہی کھلم کھلا برطانوی سپاہیوں کے ساتھ جاوا کے باشندوں کے خلاف لڑ رہے ہیں۔"

اور کوئی طلسمی طاقت بجلی کی لہروں کا گلا گھونٹ دیتی۔ کیونکہ ہندوستان کے بڑے انگریزی اخباروں میں یہ خبریوں شائع ہوتی۔

جاپانی افسر انڈونیشیا کے نام نہاد "قوم پرستوں" کے قائد ہیں

(ہمارے نامہ نگار خصوصی، سندباد جہازی، مقیم سورابیا کے قلم سے)

جب میں ولندیزیوں کے مظالم کی خبریں بھیجتا تو انڈونیشیا کے باشندوں کی بیرحمی کی خبریں چھپتیں۔ اور ایک دن میں نے نائب امیر البحر سے پھر پوچھا۔

"کیا اب تک جاپانی فوجی قیدیوں کا تخلیہ نہیں ہو سکا؟"

"بریگیڈیر میلابی کے بیرحمانہ قتل کے بعد....."

لیکن کوموڈور جونز جو' اب" امیرالبحر سے زیادہ ہوشیار ہو گیا تھا۔ کہنے لگا "اگر آپ قطع کلام کو معاف کریں' سر۔ ہم اپنے ولندیزی حلیفوں کو کیسے دغا دے سکتے ہیں۔"

نائب امیرالبحر زیادہ تر باہر رہتا' اور اب "آنکھ مارو" کی توپیں گرجنے لگی تھیں۔ ہر گرج کے بعد جو شعلہ توپ کے دہانے سے نکلتا اس کو میں سورابیا کے شہر میں ایک دھماکہ بنتے اپنی آنکھوں سے دیکھتا چیخوں کی آواز ہوا کی ایسی مدھم لہروں پر آتی کہ سوائے میرے کسی کو سنائی نہ دیتی۔

اور آخر' ایک دن میں نے کوموڈور جونز سے دوپہر کے کھانے کے بعد پوچھا "کوموڈور۔ اس انتخاب میں تم نے قدامت پسندوں کے لئے رائے دی۔ یا مزدوروں کے لئے۔"

"مزدوروں کے لئے۔"

اور پھر وہ بے معنی نظروں سے سمندر کی نیلی اٹھتی ہوئی موجوں کی طرف دیکھنے لگا اور پھر ایک بے معنی خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی کو تین طیاروں نے توڑا۔ جو سورابیا پر بم گرا رہے تھے۔

میں نے پھر سوال کیا۔ "کوموڈور تم کس شہر کے رہنے والے ہو؟"

"کاونٹری" اس نے موجوں کے جھاگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سورابیا سے

ایک زور کے دھماکے کی آواز آئی۔ اور کوموڈور نے چیخ کر کہا۔ ”آسمان کے لئے چپ ہو جاؤ۔ تم میرے اعصاب پر۔۔۔۔۔“

”آئی۔ آئی۔ سر۔“

اور دو ایک گھنٹے کے بعد ”آنکھ مارو“ کی توپیں پھر گرجیں۔ پھر سوڑابیا سے دھوئیں کے بادل بلند ہوئے۔ پھر حاملہ عورتیں اور بچے لاشیں بن گئے۔ پھر کسی کی ٹانگ اڑ کے کسی درخت کی ٹہنی سے جا اٹکی۔ پھر کسی کا ہاتھ اڑ کے کسی خندق میں جا گرا۔“

”کوموڈور“

”کیوں؟ اب کیا ہے؟“

”تمہارا تعلق نائب امیر البحر کی طرح کسی نیفر یا ویسٹ اینڈ کے خاندان سے تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔ میرا باپ مزدور تھا۔ میرا دادا کوئلے کی کان کھودتا تھا۔ اور کوئلے کی کان میں دب کے مرا۔ میرا پردادا۔۔۔۔۔ اوہ چپ کرو۔ تم ہندوستانی۔۔۔۔“

اور وہ مجھ سے چند قدم ہٹ کے جہاز کے عرشے کے آہنی کٹہرے کے پاس کھڑا ہو کے زور زور سے پائپ کا کش لینے لگا۔ میں اس کے پاس گیا تو وہ ہٹ کے دوسرے کٹہرے کی طرف چلا گیا۔ اور میں، سندباد جہازی، جس کی گردن نے پیر تسمہ پا کا بوجھ سنبھالا تھا، اس سے کہنے لگا۔ ”تم کوموڈور جونز، تم ارنسٹ بیون

ان موجوں کے جھاگ میں کب تک چھپو گے۔ ان موجوں کے اس پار آسٹریلیا ہے، جہاں کے بندرگاہوں کے مزدور......"

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔" اس کا موٹا دبیز چہرہ پسینے سے تر ہونے لگا۔ "مگر ہمارے ولندیزی حلیف ......"

"اور ان موجوں کی دوسری طرف ہندوستان ہے، یہ ایک بہت بڑا قبرستان ہے جہاں چالیس کروڑ مردے دفن ہیں۔ اور سب مردے بھوت بن گئے ہیں، اور اس بات پر جھگڑ رہے ہیں کہ قبرستان کے دو ٹکڑے ہو سکتے ہیں یا نہیں ہو سکتے میرے دوست کوموڈور جونز تمہیں اپنے ولندیزی حلیفوں سے کوئی دلچسپی نہیں تم اس قبرستان میں اپنی انگور کی بیلوں کو ہمیشہ کی طرح اگانا چاہتے ہو......"

ہماری خارجی حکمتِ عملی میں تسلسل ہے۔ قدامت پسند ہوں یا مزدور، خارجی حکمتِ عملی کے تسلسل کو......"

اس رات چاندنی سمندر کے نیلے حسن پر بھی پڑی، اور سورابیا کے بڑھتے پھیلتے ہوئے قبرستان پر بھی، نائب امیر البحر آج "آنکھ مارد" پر نہیں آیا تھا۔ اور کوموڈور مجھ سے، میری صورت سے بیزار، عرشے پر الگ ٹہل رہا تھا کہ میں نے ساحل کے قریب ایک آہٹ سی سنی۔ چاندنی کے طلسم سے خاکی ساحل سمٹ کر جہاز کے بالکل قریب آگیا تھا۔ اور پھر میں نے نومبر کی ہوا کی خنک لہروں پر سردار زادی کے لباس کی بھینی مدھم خوشبو کو محسوس کیا۔ جو بارش سے نم زمین میں کھلتے ہوئے پھولوں کی خوشبو کی سی تھی۔

ساحل پر جو کھنچ کے جہاز سے بہت قریب پہنچ گیا تھا، وہ چاندنی میں گہرے چاکلیٹ کے رنگ کا، چینی تراش کا فراک پہنے نظر آئی۔ اس کی آنکھوں کی تراش چینی تھی، اور میں ڈرنے لگا کہ اگر کہیں وہ جہاز پر آ گئی تو اس کا گرفتار ہو جانا یقینی ہے' اور میں چاہتا تھا کہ اسے اشارے سے منع کر دوں۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر دیکھا تو کوموڈور عرشے کے قریب اسی طرح ٹہل رہا تھا۔

سردارزادی کے ہاتھ سے ایک پرندہ اڑا۔ یہ شاہین یا شہباز نہیں تھا۔ جو مغل اور ترک اور ایرانی بادشاہوں کے ہاتھ سے اڑا کرتا تھا۔ یہ ایک ہُدہُد تھا۔ لمبی چونچ والا کٹھ پھوڑ۔ اور اس کے پنجوں میں' پروں میں نجّاری کے تمام اوزار تھے۔

اور وہ جہاز کے ایک کیبن کی فولادی دیوار کو اپنی لمبی چونچ سے کھُٹ کھُٹ توڑنے لگا۔ اس آواز سے کوموڈور کے کان چونکنے ہوئے۔ میں نے اُسے پھر باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ "منشور اوقیانوس کا غالباً یہاں اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ تو بحرالکاہل ہے۔ اور منشور اوقیانوس ان ملکوں کے لئے ہے۔ جن کے ساحلوں کو اوقیانوس کی لہریں دھوتی ہیں ...."

کوموڈور نے اس طرف آ کے اس "کھُٹ کھُٹ" کی آواز کی تحقیق کرنی چاہی۔ میں نے کہا۔ یہ آواز نائب امیرالبحر کے کیبن کے اندر سے آ رہی ہے۔ وہ کیبن کے اندر چلا گیا اور میں باہر آ کے ہُدہُد کو دیکھنے لگا۔ نائب امیرالبحر کے کیبن اور جہاز کی بیرونی آہنی دیوار کے درمیان دو فیٹ کی ایک پتلی سی گیلری تھی۔ ہُدہُد نے اس گیلری میں اس سوراخ سے' جو اس نے فولادی دیوار میں اندر آنے کے لئے بنایا تھا، اور کیبن کی

دیوار کے سوراخ کے درمیان، ہلکے نارنجی کاغذ کا ایک چوخانہ راستہ سا بنا لیا تھا اور اس چوخانے میں چھپا ہوا، وہ خود نظر نہ آتا تھا۔

کوموڈور نے کہا۔ "وہاں نائب امیر البحر کے کیبن میں تو کچھ بھی نہیں۔ پھر اس نے کاغذ کے اس چوخانے کی طرف دیکھا جو کسی عجیب چینی قندیل کا فانوس معلوم ہوتا تھا، اور اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں۔ اور پھر مجھ سے کہا۔ "چلو نائب امیر البحر کے کیبن میں بیٹھیں۔ میں نے کچھ برانڈی اور گرم پانی منگوایا ہے۔"

لیکن کوموڈور کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے شک ضرور ہے۔ اور مجھے وہ کسی قسم کے جرم میں شریک سمجھتا ہے۔

ہم دونوں نائب امیر البحر کے کیبن میں آئے۔ یہاں سردار زادی کا سارا زیور تھا یہ زیور نائب امیر البحر نے ایک شیشے کے شفاف صندوق کی تہ میں رکھا تھا۔ صندوق کی تہ میں سب ہی طرح کے زیور تھے۔ مرتیوں کا ایک ست لڑا ہار تھا۔ جس کی قیمت کم سے کم دس ہزار ہوگی، اور جواہرات کی مختلف چیزیں۔ شیشے کا صندوق اوپر سے کھلا ہوا تھا، اور اس میں پانی بھرا ہوا تھا، اور پانی میں چھوٹی چھوٹی سنہری مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ میں اور کوموڈور دونوں بیٹھے برانڈی پی رہے تھے کہ ہُدہُد کی کھٹ کھٹ کرنے کی آواز بند ہوگئی۔ جواہرات کے اس شیشے کے صندوق سے ایک طلائی گولی، جس کا قطر ایک انچ سے بھی کم ہوگا، ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ آہستہ آہستہ اوپر بلند ہونا شروع ہوئی۔ یہ گولی کوڑیالے سانپ کی جلد کی طرح طلائی چتیوں سے نرمئی

ہوئی تھی، اور یقیناً زیور میں شامل نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کسی طرح کے مقناطیسی جذب کی وجہ سے بلند ہو رہی تھی، اور زمین کے جذب کے مقابل اونچائی کا جذب اسے کھینچ رہا تھا۔ کو موڈور تو کیا یہ طلسم خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اور میں سوچتا رہا کہ یہ گولی کس چیز کا طلسم ہے۔ اس کا رمز کیا ہے؟ آزادی؟ عفت؟ انسانیت؟

ہُدہُد نے اپنی لمبی چونچ سے کھٹ کھٹ۔ کھٹ کر کے جو سوراخ آہنی پتّر میں کیا تھا، اس میں یہ گولی غائب ہو گئی، اور بت میں اور کو موڈور دونوں اپنی حیرت پر غالب آئے۔ وہ جلدی سے جہاز کے دروازے کی طرف بھاگا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساحل لکڑی کی ایک پرانی وضع کی کشتی، ڈونگے جیسی کشتی بن گیا تھا جس پر لکڑی کا ایک بد وضع کیبن تھا۔ میں نے خیال کیا کہ سردار زادی اس میں ہو گی، مگر وہ شاید کیبن کے اندر تھی، نظر نہیں آئی۔ ایک ادھیڑ عمر کی جادی عورت، جس کے انداز سے بڑے وقار کا اظہار ہوتا تھا۔ کیبن کے باہر کھڑی تھی۔ ایک شعلہ چمکا، جیسے جوہری بم کی تابش دو مکعب فیٹ میں محدود ہو گئی ہو۔ ہُدہُد اس کشتی اور کیبن تک پہنچ چکا تھا۔ ایک ملّاح نے جو فلم میں کام کرنے والے ایکٹروں کی طرح منہ پہ روغن لگائے ہوئے تھا، آگے بڑھ کر بانس کو جنگی جہاز "آنکھ مارو" کے فولاد سے اڑا کے اپنے لکڑی کے ڈونگے کو سمندر میں تیرا لیا۔ اور میں، سندباد جہازی، جس نے یک چشم دیو کو یکے بعد دیگرے انسانوں کو سیخ پہ بھون کے کھاتے دیکھا تھا، ڈرا۔ اور فرطِ حیرت سے کھڑا کا کھڑا ہی رہ جاتا۔ مگر میں نے کو موڈور جونز کو حرکت کرتے دیکھا، اور ڈرا

کہ ایک توپ کا گولہ اور یہ چوبی کشتی ہمیشہ کے لیے سمندر کی تہ میں جا بیٹھے کی سب مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ڈاکٹر نے میرے لیے مچھلی کا تیل تجویز کیا تھا، جو مجھ سے پیا نہ جاتا تھا اور میں بالاخانے سے پیچھے کی طرف روز ایک چمچہ تیل پھینک دیا کرتا تھا یہاں تک کہ بڑے بھائی نے میری چوری پکڑ لی۔ اور میں نے ان سے منت کر کے کہا والد سے اس کا ذکر نہ کیجئے گا اور میری منت سے وہ مان گئے۔ اور انھوں نے کہا۔ اس پر مٹی ڈال دو۔ ورنہ ایک نہ ایک دن مچھلی کے تیل کی بو سے والد کو معلوم ہو ہی جائے گا۔" اسی طرح میں کوموڈورجونز کی طرف پلٹا۔ اس کے دونوں بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑ کے میں نے کہا۔ "جونز، میرے رفیق، میرے بھائی، تم کہتے ہو تمہارے باپ، تمہارے دادا مزدور تھے، میں تم سے صرف ایک درخواست کرتا ہوں، اس چوبی کشتی کو نکل جانے کی صرف دو دن کی مہلت دو۔ اگر یہ بچ گئی تو اچھا۔ ورنہ دو دن کے بعد اگر پیچھا کرتے میں یہ تمہیں نظر آ گئی تو اسے ڈبو دینا۔ یا نائب امیرالبحر سے اس کا ذکر کر دینا۔ دو دن کی مہلت دو۔ صرف دو دن کی۔"

کوموڈور جونز نے غصے اور بے صبری سے اپنے بازوؤں کو میری گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ "میں دو دن نہیں، تین دن کی مہلت دینے کو تیار ہوں مگر یہ کشتی بچ کے زیادہ دور نکلنے نہیں پائے گی۔ دیکھتے ہو یہ کشتی دراصل جہلم کا ڈونگا ہے۔ خیر دو دن سہی۔ مگر دو دن کے بعد میں نائب امیرالبحر کو اطلاع دے دوں گا سمجھے؟ یہ میرا فرض ہے۔"

اور میں، سند باد جہازی، جس کی گمرہ دن نے پیرِ تسمہ پا کا وزن برداشت کیا تھا، سوچنے لگا۔ یہ جہلم کا ڈونگا بحر الکاہل میں کیسے آسکتا ہے۔ مگر چوبی کشتی کے تختے جہلم کے ڈونگوں کے تختوں کی طرح سوکھے اور کھردرے تھے اور وہی لمبے لمبے سیاہ کیلے۔ یقیناً یہ سب خواب ہے۔ مگر میری پلکیں گتھ گئیں۔ میں نے آنکھیں کھولنا چاہیں، اور کسی نے پپوٹوں کو گوند لگا کے چپکا دیا۔ اور مجبوراً پھر میں خواب کی دنیا میں واپس جا کے اپنی ڈائری لکھنے لگا۔ ہر روز فل اسکیپ سائز کا ایک صفحہ۔ اور ایک دن خیال آیا ان صفحوں کو گننا چاہیئے۔ اور میں نے گننا شروع کیا۔ ایک صفحہ فی روز کے حساب سے دو دن نہیں، تین دن نہیں، تین دن نہیں، بائیس دن نہیں تینتیس دن ہو چکے تھے۔ اور اب تک کوموڈور جونز نے نہ اس چوبی کشتی کا تعاقب کیا تھا، نہ امیر البحر سے اس کا ذکر کیا تھا۔ مگر یہ تو غالباً خواب تھا...... اور خواب اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

○

زرّیں تاج

جیپ بہرحال دغا دینے پر تلی ہوئی تھی۔ ہر دس دس گز پر رک رک جاتی۔ بچارا موٹا ڈرائیور محنت کرتے کرتے ہانپتے ہانپتے عاجز آچکا تھا۔ ارشد نے حسین چاندنی رات کی طرف دیکھا۔ یہ خوبصورت سڑک، اس پر بکھری ہوئی چاندنی، کناروں پر یہ اونچے اونچے درخت۔ کتنی محنت سے یہ سڑک تیار ہوئی تھی۔ اور آج ..... جنگ کا پہلا دن تھا۔ بھلا جنگ کو اور جیپ کی اس مسلسل سکرات کو چاندنی رات اور ان حسین درختوں اور اس دوشیزہ سڑک سے ذرا بھی واسطہ تھا؟

موٹا ڈرائیور شیخ احمد بڑے کمالات کا آئینہ تھا۔ ایک چھوٹی سی گلی ڈرینیج کے سلسلے میں کئی فٹ کھدی ہوئی تھی۔ اور کنارے سے موٹر تو کجا آدمی بھی بڑی مشکل سے جا سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے ارشد سے پوچھا تھا۔ "سرکار گلی بالکل کھدی ہوئی ہے۔ پھر کیا حکم ہوتا ہے۔ گاڑی کو لے چلوں!" آج انجن کے پیچھے

اس کے ہانپ ہانپ جانے پر ارشد کو ترس آرہا تھا اور غصہ بھی۔ دور پہ کوئی ریل گاڑی کھڑکھڑاتی گذر جاتی۔ لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ دور دور کسی آدمی کا سراغ نہیں، کوئی گھر نہیں۔ مذاق تو نہیں تھا۔ آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ سب جگہ بلیک آوٹ تھی لیکن چاند نے اپنا ٹھنڈا سا چراغ آسمان پر جلا رکھا تھا۔ اور سوئی ہوئی زمین پر انسان یا سنہرے خواب دیکھ رہے تھے یا ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں اسی روشنی سے مدد لے رہے تھے۔ یہ عجیب طرح کی ٹھنڈی روشنی ہے، چاند کی روشنی جس سے دو طرح کے جنون کی قندیلیں جلتی ہیں۔ جنگ کے جنون کی اور عشق کے جنون کی۔

اتنے میں اوپر سے گھر گھراہٹ کی آواز آئی۔ ارشد نے اپنے دل میں کہا — امجد بھائی نے آج دعوت کے لئے کیا اچھا دن چنا تھا..... چاندنی میں سڑک کے کنارے کے حسین درخت جیپ کو چھپا نہیں سکتے تھے۔ اور اگر کہیں یہ بدشکل سا کپڑا اوپر سے ہوا باز کو نظر آگیا تو..... موت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس نے شیخ احمد کو جلدی سے جیپ جانے کے لئے کہا۔ وہیں کہیں جھاڑیوں میں، اور خود تیزی سے سڑک کے کنارے کنارے چاندنی سے بچتا ہوا قد آور درختوں کے سائے میں پناہ لیتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ اب دور پر...

...... چشم زدن میں نزدیک ایک تیز نیلا سا ستارا دکھائی دیا، اور پھر سڑک کے بالکل قریب تقریبًا پانچ سو فٹ اوپر اس تیزی سے ہوائی جہاز اڑتا چلا گیا گویا اس کی ٹوپی کو گراتا ہوا گذر گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک منٹ کیلئے

رک گئی۔ جسم نے تھرتھری سی لی جیپ کے قریب ہی ایک شعلہ سا بلند ہوا۔ ایک سرخ سا گولہ زمین پر پھٹا اور شعلہ بلند ہوا، سرخ شعلہ۔ "سرخ پیاز" اس نے اپنے دل میں کہا۔ ہوائی جہاز نے جیپ کو مشین گن نہیں کیا تھا۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ ہوائی بیڑے شہر یا اس کے اطراف کسی طرح کی بمباری وغیرہ کی سخت مخالفت تھی۔ اب ہوائی جہاز بہت دور جا چکا تھا۔ شہر کی طرف۔ اس نے پلٹ کر شیخ احمد کو پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ الٹے پاؤں وہ جیپ کی طرف واپس ہوا۔ شیخ احمد جھاڑیوں سے نکل کے تھرتھر کانپ رہا تھا۔ اس نے پھر انجن کا رُخ کیا۔ اور اس خوف کے باوجود اس کی ہمت پر ارشد کو تعجب ہوا۔ "میں پیدل چلتا ہوں۔ تم گاڑی کو یہیں چھوڑ دو۔ چلے چلو۔"

"آپ جائیے سرکار۔ میں تو اس گاڑی کا نوکر ہوں اس کو لے کر ہی آؤں گا۔"

اسے پھر تعجب ہوا۔ ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ پھر معلوم ہوئی۔ دیکھ بھال کی اڑان کے بعد اب وہ دوسری طرف سے واپس جا رہا تھا۔ بہت دور پر۔ اور اب بہت اوپر۔ نیلا ستارہ گھڑگھڑاہٹ کی طرح مدھم ہوا پھر غائب ہو گیا۔ دونوں نے پھر بیمار جیپ کی طرف دیکھا اور ارشد نے گیبرڈین کے پتلون کی جیبوں میں ہاتھوں کو گرم رکھنے کے ارادے سے گھسیٹر کے سیٹی بجانے کی کوشش کی۔ مگر فارسی اشعار تھے کہ بادلوں کی طرح امڈتے یاد آتے چلے جاتے تھے۔ اس نے حسین رات کی طرف دیکھا معشوقوں کی طرح، عجمی شاعروں کے معشوقوں کی طرح دل ربا اور خونریز معشوقوں کے رخِ زیبا جیسا چاند، ان کی آنکھوں کی طرح چمکتے ستارے۔ ان کی زلفوں کی طرح سیاہ درختوں

اور چٹانوں کے سائے۔ ان کی پلکوں کی طرح سڑک کے کنارے کے صف بستہ درخت ان کی حنائی انگلیوں اور سرخ ہونٹوں کی طرح سرخ سرخ —— اور اسے جنگ پھر یاد آگئی اور وہ ہوائی جہاز جو ابھی گزرا تھا —— دور پر ایک موٹر گذری۔ اس وقت اور اس رات اس کے سوا کسی اور بیوقوف کی شامت آئی تھی۔ جہاں سے موٹر گذری وہاں چوراہہ ضرور ہوگا۔ چوراہہ ضرور تھا۔

اس رات کو معشوق کی حنا آلودہ ہتھیلی اور سرخ ہونٹوں کی طرح سُرخ خونریز کوئی مرئی چیز نہیں تھی۔ ٹینکوں اور توپ خانے کی گھن گرج ابھی سینکڑوں میل دور تھی، تیزی سے ہوا پر صرف موت کے آہنی فرشتے آسکتے تھے اور ان کو دیکھ کر سائرن کی وہ تیز، خون کو منجمد کر دینے والی آواز۔ ایک مسلسل فریاد، ایک مسلسل کراہ۔ وہ جو نعرے لگاتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں، وہ جو دوسروں کی رہنمائی میں چلتے ہیں۔ ذرا دیکھ بھی لیں کہ جنگ کیسی ہوتی ہے۔

کیا ہوگا؟ آج صبح سے اس کے ذہن نے تصفیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کا جواب نہ دے گا۔ ایک اور چوراہہ پر آج دوپہر کو ایک طرف سے تیز، بہت تیز ایک فوجی لاری آرہی تھی، ایک آدمی آرپار جانے والی سڑک سے تیزی سے سائیکل پر چلا آرہا تھا۔ ارشد نے بڑی حماقت سے اپنے حق میں پشین گوئی کی "اگر اس فوجی لاری سے یہ سائیکل ٹکرائی تو میں بھی اس جنگ میں ختم ہو جاؤں گا۔" لیکن سائیکل نہیں ٹکرائی۔ فوجی لاری، سائیکل کو اور سائیکل فوجی لاری کو جل دے کر نکل گئے۔ آنکھ مچولی میں تھوڑی دیر

کے لئے زندگی موت سے جیت گئی۔

آدمی نہ آدم زاد۔ اور ابھی رات کے دس ہی بجے تھے۔ شہر سے صرف سات میل دور۔ جیسے طلسمِ ہوشربا کا کوئی شہزادہ کسی طلسمی جنگل میں چلا جا رہا ہے ــــ حشرات الارض کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ جھینگروں کی، سانپوں کی، اور دور دور کتوں کی۔ ابھی بہت دور تک کوئی مکان نہیں تھا۔ ایک فیکٹری کے چراغ بہت فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ لیکن باہر سے چاندنی کفن کی طرح اسے بھی لپیٹے تھی۔

اور دفعتہً چاندنی اسے بڑی ہی دلکش معلوم ہوئی، خواب کی طرح، عشقِ حقیقی کی طرح، ذرا ذرا سے سلجھے ہوئے جنوں یعنی جنونِ ذی فنون کی طرح۔ اور اسے سڑک پر اپنے جوتوں کی چاپ کچھ عجیب معلوم ہوئی جیسے کوئی اس زندگی میں نہیں کسی اور زندگی میں چل رہا ہے، جیسے وقت کی طنابیں گر گئی ہیں۔ جیسے وہ ماضی میں یا مستقبل میں چل رہا ہے اور حال معدوم ہے۔ جیسے وہ مردہ ہے ......

اور اگر کہیں یہ سچ ہو۔ وہ ہوائی جہاز جو اس قدر نیچے سے گذرا تھا۔ فرض کرو کہ اس نے "سرخ پیاز" نہیں گرایا تھا۔ وہ ایک بم تھا۔ جیپ، شیخ احمد اور وہ خود سب مر چکے ہیں، فنا ہو چکے ہیں۔ وہ اس سڑک پر چلا جا رہا ہے۔ کہ اس زندگی اور اُس زندگی میں تسلسل ہے یا یہ محض اسی کی یاد، اسی کا سلسلہ ہے ......

اور معلوم نہیں یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ برفانی قطبِ جنوبی کے سیاحوں کا زائد ساتھی۔ ٹی، ایس۔ ایلیٹ والا" یہ تیسرا کون ہے۔" یہ کون ہے

جو اس کے ساتھ چلا جا رہا ہے وجود سے عدم، عدم سے وجود کی طرف۔ جیسے ماضی اور حال اور مستقبل کی سرحدیں مٹ گئی ہوں جیسے۔

یہ قدموں کی چاپ، یہ جوتوں کی چاپ۔ یہ اس کی اپنی رفتار کی نشانی ہے۔ وہ اپنے گھر جا رہا ہے، پیدل، کیونکہ جیپ خراب ہو گئی ہے اور بچارا شیخ احمد اب بھی اس کے انجن سے گتھا ہوا ہے۔ مگر یہ چاندنی رات اس قدر دلکش، اور حسین اور یہ سڑک، یہ چاندنی رات میں نہائی ہوئی دوشیزہ۔ یہ درختوں کے سائے، یہ کالی کالی زلفیں......

اور وہ جس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی، وہ دوسرا ساتھی، چاندنی رات میں اس ویران حسین سڑک پر اس کا ہم سفر..... اس نے چاند کی طرف دیکھا اور پھر اپنی حسین ساتھی کی طرف۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں زرّین تاج ہوں۔"

اس نے بیسیوں زندہ عورتوں سے عشق کیا تھا۔ ہوس آرائی کی تھی، تفریح کی تھی، کشش محسوس کی تھی۔ کبھی ہوس کا خاتمہ عشق پر ہوتا۔ کبھی عشق کا ہوس پر۔ اور ہمیشہ اس کا باعث یہ ہوتا کہ دونوں لاکھ کوشش کرتے "دوتی" فنا نہ ہوتی۔ دونوں ایک معاشی عمرانی نظام کی پیداوار ہوتے، اور یہ نظام ان کے راستے میں سنگلاخ مزاحمتیں، کانٹوں کی جھاڑیاں، دیو ہیکل چٹانیں حائل کرتا جاتا۔ جن سے ہوس عشق بن جاتی اور کبھی یہ مزاحمتیں غائب ہو جاتیں تو عشق ہوس ہو جاتا۔ اور پھر ہوس کے بعد

تھکن اور پھر عذر واماندگی اے حسرت دل .... اور پھر یہی سلسلہ۔

ایک دن اس نے اکتا کے کہا تھا اب میں کسی ایسی عورت سے محبت کروں گا۔ جسے مرے صدیاں ہو چکی ہوں گی۔ ایک دن انسان ماضی میں سفر کر سکے گا۔ اس دن اس کے ساتھ بھی یہی مسائل پیدا ہوں گے۔ لیکن ابھی تو یہ ممکن نہیں۔

زرّیں تاج کو مرے سو سال کے قریب ہونے کو آئے ہیں۔ اور اس شاعرہ کا کلام پڑھ کے جس نے باب کو دیکھنے سے پہلے اس کی تعریف اور اشتیاق میں دنیا کی دو حسین ترین نظمیں لکھی ہیں۔ اس نے زریں تاج کو مخاطب کر کے کہا۔ "ان تمام عورتوں میں جو مر چکی ہیں مجھے سب سے زیادہ تم سے محبت ہوئی ہے۔ اگر کبھی حال ماضی کی طرف جا سکا یا میری روح تمہاری روح کے جمال کا دیدار کر سکی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تب بھی دورانِ محض میں، مرورِ خالص میں تم سے مخاطب ہوں گا اور تم سے اپنی اس محبت کا اظہار کروں گا جو عشق سے، ہوس سے، خواہش سے، ادراک سے، جواب سے ماورا ہے۔

آج اس چاندنی میں لٹی ہوئی حسین، ویران تنہا سڑک پر ایک اجنبی ساحرہ کی طرح وہ اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس پل صراط پر۔ زندگی سے موت کی طرف .... صدیوں کے آر پار۔ اور پھر اس نے زرّیں تاج کی طرف دیکھا۔ اس نے نقاب الٹ دیا تھا، یوں اس کا لباس سیاہ تھا۔ خلیجی عورتوں کی طرح۔ ایسا لباس جیسا کہ شاید اس نے محمد علی بار فروش کے ساتھ کجاوے میں پہنا ہوگا۔ اور اس کا

چہرہ چاندنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ یہ موت کی، کافور کی چمک تھی۔ ایک حسین آسیبِ الفت کے چہرے کی چمک۔ جیسے ملکۂ کوکاچین کی مہکی ہوئی لاش کا مارکو پولو کے نام یہ پیغام۔

"یہ کہہ دینا کہ میں نے محبّت کی اور مر گئی۔ اب میں محبت ہوں اور زندہ ہوں۔ اور چونکہ زندہ ہوں بھول گئی۔ اور چونکہ محبت کرتی ہوں معاف کر دوں گی۔"

تب ارشد نے اس طرح جیسے کوئی سلسلۂ خیال سے چونک پڑتا ہے۔ جیسے کوئی خواب میں خواب سے بیدار ہوتا ہے، جیسے کسی نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہو۔ کہا۔ "تم ملکۂ کوکاچین ہو۔ تم زرّین تاج ہو۔"

اور اس کی ہم راہ حسینہ ہنسی۔ "کوکاچین نہیں وہ چینی تھی۔ وہ تو صرف عجم بیاہ کر آئی تھی۔ میں زرّیں تاج ہوں۔ میں عجم کی نسوانیت ہوں جو صدیوں میں ایک آدھ مرتبہ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے، اور مردوں کو ششدر کر دیتی ہے۔ وہ پہلے مجھے دیکھ کر عشق عشق کرتے ہیں۔ پھر محبت کرتے ہیں، جس کے معنی زیادہ تر یہ ہوتے ہیں کہ بڑی سے بڑی قیمت دے کر وہ میرا جسم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شہنشاہ مجھے موتیوں میں تولنا چاہتا ہے۔ فن کار خونِ جگر میں اور مزدور مجھے دیکھے بغیر چپکے سے گذر جاتا ہے اور اگر وہ محبت میں کامیاب نہیں ہوتے تو پھر مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں، اپنی رقیب سمجھ کر۔ اور جب میں مر جاتی ہوں تو سینکڑوں برس میری پرستش کرتے ہیں۔ اب تم نے مجھے پہچانا۔

پھر سائرن کی خوفناک ہسٹریائی چیخ نے فضا میں لہرانا شروع کیا۔ رات نے ایک جھرجھری لی، چاندنی کانپ گئی، سب درختوں اور ان کے سایوں کو فالج مار گیا۔ دور پھر ایک ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پھر ایک نیلا ستارہ چمکا۔ پھر کتے بھونکے جھینگروں کے گانے میں خلل نہیں آیا۔ اور ارشد نے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ زرّیں تاج برابر اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ موت اور حیات کی درمیانی شاہراہ پر، پل صراط پر چاندنی کے برزخ میں۔

دور پر ہوائی جہاز نے پھر "سرخ پیاز پھینکے" زمین سے ٹکرا کے پھر سرخ شعلے اٹھے۔ پھر ہوائی جہاز نے شہر کے اطراف ایک چکر لگایا۔

اور وہ چاندنی سے زیادہ خوبصورت تھی، چاندنی سے زیادہ حسین، ایرانی شاعری کی روح کی طرح جمیل، اس کے لب لعلین چاندنی رات میں چمک رہے تھے۔ سینکڑوں میل دور ٹینکوں سے سچ مچ کا خون بہہ رہا ہوگا، اور سچ مچ کے پناہ گزین غنڈوں کے ہاتھ لٹ رہے ہوں گے اور سچ مچ کی عورتیں اپنی عزت —— زمانۂ امن کا تصور۔ بچانے کے لئے کنوؤں اور باولیوں میں گر رہی ہوں گی۔ مگر یہاں تو ابھی تک صرف ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ پل صراط کے اس پار تک، جس پر سے گذرتے ہوئے زرّیں تاج نے پوچھا۔ "اپنی کہانی سناؤں؟"

اب ہوائی جہاز جا چکا تھا۔ اب پھر رات کے پرانے محرم راز کتے، سانپ اور جھینگر باقی رہ گئے تھے۔ اور انسان کھڑکیوں کے شیشوں پہ سیاہ کاغذ لگائے

حشرات الارض کی طرح چھپے ہوئے تھے۔

اور چاندنی رات میں زرّیں تاج حد سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے آپ سے ارشد نے اس طرح کہا گویا اسے زرّیں تاج کے ساتھ ہونے کا یقین نہیں آیا! "میں نے دیکھے بغیر تجھ سے محبت کی۔ کاش مرنے سے پہلے ایک بار تجھے دیکھ لیتا۔"

مگر وہ تو اس کے ساتھ پل صراط پر چل رہی تھی۔ چاندنی رات میں۔ اور وہ مسکرائی۔

چاندنی رات میں چاند چمکا اور موتی بکھر گئے۔

اور ارشد نے اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا۔ گویا وہ پہلی مرتبہ چاند کو دیکھ رہا تھا۔ اسے نہیں دیکھا۔ مگر کتنی بار دیکھا ہے۔

تب زرّیں تاج کا، کالا، طلسمی عورتوں کا سا لباس چاندنی رات میں یک لخت چمکا۔ جیسے سڑک پر پڑا ہوا شیشے کا ایک ٹکڑا — اور اس نے اپنا قصّہ سنانا شروع کیا۔

میرا نام سیرا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ میں یونان سے ایران آئی۔ لیکن میرے خون کے ایک ایک قطرے میں عجمیت ہے۔ مجھے ایرانیوں نے شیریں کہا اور مجھ میں ایرانی نسوانیت کی مٹھاس بھر دی۔

میں رومی نژاد تھی، عیسائی تھی، مجھے کسی افسانہ نگار نے ماریس شہنشاہ کی بیٹی قرار دیا۔ کسی نے مہین بانو کی، لیکن میں ایرانیت میں اس قدر کھو گئی کہ نہ مجھے

اور نہ کسی اور کو میرے اجنبی ہونے کا احساس تھا۔ مجھے ایران نے شیریں بنایا اور میں نے ایران کو اس کا سب سے پیارا افسانۂ عشق دیا۔

خسرو نے رومیوں سے ہزار عورتیں چھینیں، ہزاروں کو بیوہ کیا۔ اس کے سپاہیوں نے ہزاروں کو بے آبرو کیا۔ یہ اس زمانے کا دستور تھا۔ تمہارے ملک میں اب تک یہی ہوتا ہے۔ میں تاریخ سے گھبراتی ہوں جو اپنے آپ کو نہیں دہراتی۔ مگر اپنی سیہ کاریوں کو ضرور دہراتی ہے۔ اس لئے نظامی گنجوی کے ساتھ ساتھ چلو۔

میں مہین بانو کی تربیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوں۔ مجھے شہسواری آتی ہے، شکار کھیلنا آتا ہے، راویوں سے کہانیاں اور نظمیں سننا آتا ہے۔ میں مکالماتِ عشق میں ماہر ہوں، اور اپنی سہیلیوں میں اس طرح دمکتی ہوں جیسے تاروں میں چاند۔ خسرو، جس کو اس کے مردانہ حسن کی وجہ سے سب پرویز کہتے ہیں، میرے حسن و جمال کی تعریف سنتا ہے مجھ پر نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے۔ اور مجھے ڈھونڈھنے شیرویہ کو بھیجتا ہے۔ گویا شہزادہ "دل" ہے جو "نظر" کو میری تلاش میں روانہ کرتا ہے۔

اور میں شکار کھیل رہی ہوں، اپنے تیرِ مژگاں سے ہرنوں کا شکار، اور اپنی ہرنوں جیسی آنکھوں سے دلوں کا شکار۔ میری سہیلیاں میرے ساتھ ہیں، جنہیں مہین بانو نے میری دلجوئی، میرا دل بہلانے اور میری نگرانی کے لئے مقرر کیا ہے۔ شیرویہ آتا ہے۔ دل کا چالاک وزیر، خسرو کا چالاک وزیر، اور پتھر پر اس کی تصویر بنا دیتا ہے۔ میں مبہوت رہ جاتی ہوں۔ سہیلیاں کہتی ہیں۔ "شیریں۔ شیریں تو خواب دیکھ رہی ہے، یہ طلسمات کا

جنگل ہے" اور ہم سب وہاں سے آگے چلتے ہیں کسی اور جنگل میں جو زلفوں کی طرح تاریک ہے، جس میں صبا تک اچھی طرح شانہ نہیں کرتی؟ اور یہاں مژگاں کو پھر ہرنوں کی نئی ڈار، نئے بسملوں، نئے مقتولوں کی تلاش ہوتی ہے۔ مگر وہ چالاک وزیر شیرویہ، بزرگ مہر کا خسر پھر آتا ہے، پھر پتھر پر ایک تصویر بناتا ہے۔ میں پھر محو ہو جاتی ہوں۔ گویا میں خواب میں چل پھر رہی ہوں۔ سہیلیاں پھر تاڑ جاتی ہیں کہ اس نقش کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مجھے پھر وہاں سے لے چلتی ہیں۔ ایک اور صحرا اور زلفیں اور ہرنوں جیسی آنکھیں، مژگاں کے اور سوفارِ ابروؤں کی اور کمانیں لیکن شیرویہ پھر آ پہنچتا ہے، اور ایک چٹان پر پھر خسرو کی تیسری تصویر بناتا ہے۔ اب میرا دل اپنے قابو میں نہیں رہتا۔ مجھے فارسی شاعری کی ایک روایت کو جنم دیتا ہے۔

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا میشود

مجھے اس شہریار سے دل و جان سے محبت ہو جاتی ہے۔ جس کی یہ تصویر تھی۔ اس مرتبہ مہین بانو کی سکھائی ہوئی سہیلیاں مجھے بہلا نہیں سکتیں۔ چل نہیں دے سکتیں۔ وہ پتھر کا نقش میرے دل پر مرتسم ہو چکا ہے۔ میں چپکے سے ان کو چھوڑ کے نکل پڑتی ہوں۔ میں شہسوار ہوں۔ یہ صفت میں نے تاتاری معشوقوں سے لی اور ایرانی نازنینوں کو عطا کر دی۔ راستے میں چشمہ ملتا ہے۔ چشمۂ آبِ حیواں، چشمۂ نرگس، چشمۂ آبِ حیات، چشمۂ تسلسلِ حیات یہاں میں گھوڑے پر سے اتر پڑتی ہوں میں کپڑے اتارتی ہوں میں شاعروں کا سراپا بن جاتی ہوں۔ میری سیاہ زلفوں میں راتوں کی تاریکی اور سایوں کا رنگ ہے اور یہ

زلف حبل المتین بھی ہے۔ میری آنکھیں نرگس ہیں، میری پیشانی چاند، میرے [illegible] لعل، میرے دانت موتی، میرے شانے آئینے اور بھرنا زپستان، موئے کمر، ساق سیمیں جب ٹھہر جاتی ہوں سرو ہوں اور جب چلتی ہوں قیامت۔ یہ کیا غضب ہے۔ کہ تمہارے شاعروں نے میرا سراپا تو یاد رکھا مگر مجھے بھول گئے۔

اور داستانوں کے شہزادوں کی طرح خسرو پرویز بھی اس چشمے پر آنکلتا ہے۔ بہرام کو شکست دینے کے بعد ہمارے افسانے میں کوئی مقام نہیں، کوئی موسم نہیں، کوئی دیار نہیں۔ زمین زمین ہے اور آسمان آسمان ہے۔ خسرو چشمے میں پہلے میرا عکس دیکھتا ہے، پھر میری جانسوز عریانی دیکھتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھ تک پہنچ سکے میں اپنا تن ڈھانک کے، اپنے بادپا رہوا پر سوار ہو کے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہوں۔ مگر اسے اپنی نظروں سے گھائل کر کے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے...

اور وہ شیرویہ کو مہین بانو کے پاس بھیجتا ہے۔ اسکی دال نہیں گلتی۔ مہین بانو مجھے سمجھاتی ہے کہ جو آسانی سے حاصل اور آسانی سے فنا ہو گیا وہ ہوس ہے۔ اور وہ جو مشکل سے حاصل ہوا اور کبھی فنا ہوا کبھی فنا نہیں ہوا عشق ہے اور وہ جو بڑی مشکل سے حاصل ہوا کبھی فنا نہیں ہو گا عرفان ہے اور وہ مجھے سمجھاتی ہے کہ ایرانی خواتین میں سے وہ جن کا صدیوں میں ایک آدھ بار بروز ہوتا ہے آسانی سے اپنے آپ کو اپنے عاشق کے حوالے نہیں کرتیں عشق کی بجلی ٹھوکروں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے "جفا" کی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر "وفا" پیدا نہیں ہوتی۔ میں یہ سب سنتی ہوں، یہ سب مان لیتی ہوں کیونکہ مجھے تمہاری عجمی شاعری کی روایتوں کی تخلیق کرنی ہے۔ خسرو، مجھ

تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اور میں اسے پہنچنے نہیں دیتی۔ شیرویہ آتا ہے۔ اور ناکام واپس جاتا ہے۔ اب مہین بانو مر چکی ہے۔ اس کی جگہ میں اپنی اقلیم کی ملکہ ہوں۔ خسرو پرویز دیارِ عشق کا شہریار ہے۔ میں دیارِ حسن کی ملکہ ہوں۔ زاری، زر، زور کوئی طاقت مجھے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتی۔

اور جب وہ مجھے پا نہیں سکتا تو شکر سے دل بہلانے لگتا ہے۔ تم جانتے ہو یہ شکر کون ہے۔ یہ عورت کا جسم ہے۔ اور میں جو شیریں ہوں عورت کی روح ہوں۔ ایرانی عورت کی۔ شکر حرم میں داخل ہو سکتی ہے۔ میں یا ملکۂ عالم ہو کے رہ سکتی ہوں یا پھر بھلا دی جاتی ہوں۔ خسرو شکر سے دل بہلاتا ہے۔ مگر شکر بھی اسے آسانی سے نہیں ملتی۔ وہ خسرو پرویز کو شراب کے نشے میں بدمست کر دیتی ہے اور ایک بدہیئت کنیز کو اپنی جگہ اس کے پاس بھیج دیتی ہے۔ جسم جسم سب برابر ہیں۔ یہاں تک کہ جب نشہ اترتا ہے تو خسرو پرویز کو غصہ آتا ہے۔ جسم جسم کا فرق اس پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہی سراپا والی بات۔ اور بالآخر شکر اسے مل جاتی ہے۔ لیکن میں جو شیریں ہوں۔ عجمی نسوانیت کی روح اس سے اب بھی دور ہوں۔ بہت دور۔ وہ اگر اپنے ملک کا بادشاہ ہے تو میں اپنے دیار کی ملکہ، اور زاری، زر، زور کسی کی مجھ تک پہنچ نہیں۔ زاری البتہ کبھی کبھی میرے کنگرۂ بام سے ٹکرا جاتی ہے۔ مگر میرے سکون و اطمینان میں فرق نہیں آتا۔ میں شیریں ہوں عجمیت کی روح کوئی خرید نہیں سکتا۔

نظامی نے بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں۔ دربار کی پلی ہوئی شاعری سے اور توقع

ہی کیا ہے۔ فرہاد کا قصہ بیچ کا نہیں بعد کا ہے، میں اسے بعد میں بیان کروں گی۔ اب خسرو پرویز میرے دیار میں آنا چاہتا ہے، دیارِ جمال میں۔ اس کی سپاہ، میرے دارالسلطنت میرے قلعے کے اطراف حیران کھڑی ہے۔ وہ خندق کے پاس کھڑا ہے، منت وزاری کر رہا ہے۔ میں ایک جھروکے میں نمودار ہوتی ہوں۔ وہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے اور یہ اجازت اسے نہیں ملتی۔ وہ حجت کرتا ہے اور میں اس کی ہر حجت کا جواب دیتی ہوں۔ وہ وفا جتاتا ہے۔ میں اسے شکر کے عشق کا طعنہ دیتی ہوں۔ وہ مجھے جفا پر ملامت کرتا ہے۔ میں اسے جفا کے معنی سمجھاتی ہوں اور اسی طرح سوال وجواب ہوتے رہتے ہیں۔ آنکھوں کے جھروکوں سے جو اِن خمسہ سے شخصیتوں کی بجلی سے۔ اور بالآخر میں اسے اندر آنے کی اجازت دیتی ہوں تو وہ مجھے مسحور کرنے کے لئے اپنی وارداتِ دل باربد کی زبانی سنواتا ہے، میں نکیسا کی زبانی اس کا جواب سنواتی ہوں۔ روح کی فصیل میں جگہ جگہ شگاف ہیں، جن میں اس کا امڈتا ہوا لشکر داخل ہو چکا ہے۔ مگر قلب میں کوئی چیز محفوظ ہے۔ ایک زمہریر ہے جسے کوئی گرما نہیں سکتا پگھلا نہیں سکتا۔ کیونکہ میرا جوہر ایسا تھا کہ اسے کوئی خرید نہیں سکتا۔ خسرو پرویز نے مجھے خرید لیا۔ میری جنس خرید لی، میرا حسن خرید لیا، میری ہوس خرید لی۔ میری نسوانیت خرید لی۔ مگر اب بھی قلب میں ایک مقام ایسا تھا جہاں وہ پہنچ نہ سکتا تھا۔ "ہزار افسانہ" کے چالیس دروازوں والے قصر کی طرح میں نے ان میں سے انتالیس دروازوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں اور چالیسویں دروازے کی کنجی اس کے حوالے کرنا میرے بس کی بات نہ تھی، حالانکہ

اس کی محبت، اس کا جسم، اس کی وجاہت جس نے اسے پرویز کا خطاب دلوایا مجھے بہت عزیز تھی۔

یہ چالیسویں کنجی کسی اور کے قبضے میں چلی گئی۔ میں نے نہیں دی۔ خود بخود چلی گئی۔ کیونکہ ان معاملات پر کسی کا اختیار نہیں۔ اور جس شخص کے پاس یہ کنجی گئی۔ اس کا نام فرہاد تھا۔ وہ ایک مہندس تھا ـــــ اس کا ترجمہ اپنے زمانے کی زبان میں چیف انجنیئر کرنا ـــــ اس زمانے میں دو ہی طبقے تھے۔ ایک امیر اور دوسرا غریب۔ اور مہندس مزدور تھا۔ میں تم سے کیا کہوں۔ میرا فرہاد نظامی کا فرہاد نہیں تھا وہ شیرویہ کی ضد تھا۔ وہ مزدک کا مظہر جمال تھا۔ اس کے اعصاب پتھر توڑتے توڑتے فولاد کی طرح مضبوط ہو گئے تھے۔ اور اس کے چہرے پر عشق کے درد کے ساتھ بھوک کا جلال تھا۔ لیکن پرویز سونے سے اس کی بھوک نہ بجھا سکا۔ وہ اس کے عشق ہی کا ایک حصہ تھی۔

بقیہ قصہ تو تم کو معلوم ہے۔ میری زبانی میرے رنج و درد کی کہانی سن کر تم کیا کرو گے۔ جب دیکھا کہ اس کے عشق سے بدنامی ہو رہی ہے، اور جب دیکھا کہ میں اپنا دل ہار چکی ہوں، تو وہ شہنشاہ جس کے لشکریوں نے لاکھوں کا خون بہایا تھا۔ اپنے آپ میں اتنی جرأت نہ پیدا کر سکا کہ اس مزدور کو قتل کر سکتا۔ شیرویہ کا بھی یہی مشورہ تھا۔ شیر کے ساتھ ایک روباہ ہوا کرتی ہے۔ جس کا مشورہ ہمیشہ یہی ہوا کرتا ہے کہ جو گڑ سے مر سکتا ہے اسے زہر دینے کی ضرورت نہیں۔

اور اس طرح جیسے مدن سینا نے اپنے عاشق سے وعدہ کیا تھا، خسرو نے میری طرف سے وعدہ کر لیا کہ اگر اس نے بے ستون کو کھود دیا تا کہ جوئے شیر پہاڑ کے اس طرف آ سکے تو میں اس کے حوالے کر دی جاؤں گی۔ وہ شہنشاہ جس کے حرم میں سینکڑوں عورتیں تھیں اور سینکڑوں عورتیں آ سکتی تھیں۔ اس قسم کے لین دین کو عار نہ سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کام ناممکن بھی تو تھا۔

اور فرہاد، وہ "گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب" اپنے تیشے سے پہاڑ کاٹتا رہا۔ وہ پتھر پر میرا نقش بناتا۔ جیسے شیرویہ نے رجھانے کے لئے میری دوشیزگی کے زمانے میں تین بار چٹانوں پر پرویز کا نقش بنایا تھا۔ فرہاد ہر بار میرا نقش بنا کے مایوس ہو جاتا۔ میرے حسن میں ایک بات تھی۔ جو وہ بار بار ان نقوش میں پیدا کرنا چاہتا اور بار بار ہار جاتا وہ پھر سے اس مجسمے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا اور پھر نئی تصویر کھودتا۔ اور اس طرح پورا پہاڑ کٹ گیا۔

اور تب میرا شہریار شوہر بہت پریشان ہوا۔ اس نے پھر شیرویہ کو بلایا، شطرنج کے موجد کے نانا جان کو۔ اور روباہ نے پھر روباہی کی چال چلی میرے مرنے کی افواہ فرہاد کو پہنچائی ——— اور اس کم ہمت مزدور، کم ہمت مہندس نے اسی تیشے سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا، جس سے اس نے میرے مجسمے بنائے تھے، بے ستون کو کھودا تھا، مجھے پا لیا تھا۔ تمہارے اس ہندوستانی شاعر نے بہت خوب لکھا تھا، میری روح سن کر پھڑک اٹھی۔ وہ مزدور، اپنی بے بسی کی رسوم و قیود کا کس قدر پابند تھا۔

مرجانے کے لئے اسے اسی تیشہ کی ضرورت ہوئی۔ وہ اپنے دل کی حرکت روک کے مرسکتا تھا یا بے موت کے اس طرح مرسکتا تھا کہ اس کی زندگی کے ہر ہر لمحے میں موت کا مزہ ہوتا۔ وہ سقراط کی طرح تہلاب کا جام تلچھٹ تک مزے لے لے کر پی سکتا تھا۔ یہ رومیو کی سی موت کتنی بے معنی تھی۔

اور اب زرین تاج یعنی شیریں یعنی عجمی نسوانیت کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوئی اور اس نے کہا۔ کبھی کبھی مجھے اس کا بھی خیال آتا ہے کہ وہ اسی تیشے سے خسرو پرویز کی سلطنت الٹ سکتا تھا۔ مگر افسوس اس کا تیشہ درفش کاویانی نہ بن سکا۔

سائرن کی دلدوز چیخ پھر ہوا میں ذرا دیر کے لئے گونج کے خاموش ہو گئی۔

اور پھر زرین تاج نے کہا۔

میرا نام مہر النساء تھا۔ میں ایرانی تھی اور میرا ریشہ ریشہ ایرانی تھا۔ ماں باپ کے ساتھ میں ہندوستان آئی۔ مغلوں کے دربار میں میرے خاندان کو جگہ ملی اور وہ افسانہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ پائیں باغ میں شہزادہ سلیم دو کبوتر میرے دونوں ہاتھوں میں تھام کے کسی کام سے گیا۔ ایک کبوتر پھڑ پھڑا کر اڑ گیا۔ اس نے واپس آکے مجھ سے ناراض ہو کے پوچھا، کیسے اڑ گیا تو میں نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔ اور کہا۔ ”ایسے اڑ گیا۔“ کہتے ہیں میری یہ ادا شہزادے کے دل میں کھب گئی اور مجھ پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ جیسے وہ اس سے پہلے دل و جان سے

انارکلی پر عاشق ہو گیا تھا۔ اور اس سے پہلے ......

لیکن مجھے معلوم نہ تھا عشق و محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ ابھی میں دوشیزہ تھی۔ میری ایرانیت ابھی خوابیدہ تھی۔ شہنشاہ اکبر البتہ جانتا تھا کہ محبت ذرا خطرناک سی چیز ہوتی ہے۔ اب اس کے لئے دو صورتیں تھیں کہ یا تو وہ مجھے انارکلی کی طرح دیوار میں چنوا دے یا کسی اور سے میری شادی کرا دے۔

میں ایسی حسین اور ایسی معصوم تھی کہ شہنشاہ نے مجھے قتل نہیں کیا۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ کسی نہ کسی شہنشاہ نے کسی نہ کسی زرّیں تاج کو قتل کرا دیا ہو۔ لیکن میں خوش قسمت تھی۔ میری شادی ایک بڑے ہی حسین مرد بڑے ہی بہادر آدمی سے کرا دی گئی۔ اس کی شجاعت کی وجہ سے اسے شیر افگن خاں کا خطاب دیا گیا۔ اور اپنے شوہر کے آغوش میں میں نے پہلی بار محبّت کرنا سیکھا۔

وہ بہادر تھا، جری تھا، اس کے قویٰ مضبوط تھے، اس کا سینہ چوڑا چکلا تھا۔ اور میں اس کے ساتھ خوش تھی۔ مجھے اس سے ایسی محبت ہوئی جو کسی اور سے کبھی نہیں ہوئی، نہ ہو سکتی تھی۔

مگر بادشاہ مرتے ہیں اور ان کی جگہ ان کے بیٹے بادشاہ ہوتے ہیں۔ اور اپنا انتقام لیتے ہیں۔ مگر میرے جری اور بہادر شوہر نے تو جہانگیر کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ کبھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ وہ اس کے باپ کا وفادار تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا وفادار رہا۔

اس پر بغاوت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ سرکشی کا الزام نہ لگ سکتا تھا۔ اس لئے اسے ایک دن جب کہ وہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ دھوکے سے قتل کرا دیا گیا۔ وہی فرہاد والی بات۔ وہ جو شیر افگن تھا۔ شیروں کا شکار کھیلتا تھا شاہانہ روباہی کا شکار ہو گیا۔

اور میں حرم میں لائی گئی۔ مہینوں اور برسوں میں حرم میں داخل ہونے سے انکار کرتی رہی۔ مگر شہنشاہ کو تو بھولے پن سے مہرالنسا کا دوسرے کبوتر کو اڑا دینا یاد تھا۔ اس لئے جوں جوں انکار بڑھتا گیا۔ میری قیمت بڑھتی گئی۔

عورت کے خون میں قدرت نے کچھ عجیب کمزوری دی ہے جو جتنا زیادہ تعاقب کرتا ہے، اپنے صیاد سے دور بھاگنے میں اس کی قوتِ ارادی اتنی ہی کمزور ہوتی جاتی ہے۔ جتنے عرصے تک یہ تعاقب جاری رہتا ہے اسی کی مناسبت سے اس کی مزاحمت گھٹتی جاتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقتول محبوب کے قاتل کو پہلے برداشت اور پھر پیار کرنے لگتی ہے۔ اس وجہ سے بھی بہت سی عورتیں جو تمہارے اس برِاعظم میں آجکل اغوا کی جاتی ہیں، اپنے ظالم عاشقوں کے چنگل سے چھوٹ کے آنا نہیں چاہتیں۔ کچھ اسی طرح کی کمزوری مجھ پر بھی حاوی ہوتی گئی اور بالآخر میں نے "ہاں" کہہ دیا۔ اور میں کئی میں سے ایک۔ کئی بیگموں میں سے ایک ہو کے رہ گئی۔ اور مجھے "نور محل" کے نام سے سرفراز کیا گیا۔ ایسی محلات کئی تھیں۔

محبت، یعنی اس قسم کی محبت جیسی مجھے شیر افگن سے تھی، اب میرے دل میں مر چکی تھی۔ بالکل مٹ چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک عجیب طنزیہ محبت تھی۔ مقید طائر کی

محبت صیاد کے ساتھ۔ گھوڑے کی محبت اپنے آقا کے ساتھ۔ اور اس طرز یہ محبت میں میں نے کہ دو پش کا جائزہ لینا چاہا تو اپنے آقا اور شہنشاہ اور نئے شوہر کو موم کا بنا ہوا پایا جس کے ہاتھ میں آہنی گرز دے دیا گیا ہو اور جس نے ہزار ہا شیر افگنوں اور اور ابو الفضلوں کے قتل کی تلافیِ مافات کے طور پر ایک طلائی زنجیر کھلونے کی طرح آویزاں کر رکھی تھی اور اسے زنجیرِ عدل کا خوش نما نام دیا تھا۔

سلطنت اس نے شراب کے ایک جام کے عوض میرے حوالے کر دی تھی۔ میں نے بہت سے امرا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ میں نے اس کی کوشش کی کہ جہانگیر کے بعد میرا نام چلے۔

ادھر حسن و جمال کے محاذ پر میں نے بہت سی نفاستیں ایجاد کیں۔ عرقِ گلاب سے غسل کرنے کے اصول دریافت کیے، خوشبوؤں، پیشوازوں، زیوروں میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ میرے تاج میں ہیرے جگمگاتے تھے۔ انہیں میں سے ایک ہیرا جہانگیر بھی تھا۔

اور عین اس زمانے میں جو میرے عروج کا زمانہ تھا ایک درویش نے میرے شہنشاہ شوہر کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ شیخ احمد سرہندی کے متعلق میں نے جہانگیر کو بہت سمجھایا۔ ان لوگوں میں ایک بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ بادشاہوں سے اونچے سمجھے جائیں۔ میں نے شہنشاہ سے کہا اسی تیری سلطنت میں برہمن کھتریوں سے افضل سمجھے جاتے ہیں۔ درویشوں کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ اگر تو انہیں قتل کرا دے

تو دنیا قیامت تک تجھ پر نفرین بھیجتی رہے گی۔ اور ان کو شہید تصور کر کے ان کے مزار کی زیارت کو آیا کرے گی۔ اس کو اپنے حال پر چھوڑ۔ تجھے ہندوستان کی شہنشاہی میسر ہے۔ اسے دل کی شہنشاہی کرنے دے۔ وہ تیرا کیا بگاڑ رہا ہے؟

لیکن ایک پیالی کے عوض سلطنت میرے ہاتھ بیچ چکنے پر بھی جہانگیر کو طاقت کا گھمنڈ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور سر ہندوستان میں اس کا اتنا بلند ہو یا اس کے آگے نہ جھکے۔ آخر وہی جہانگیر تو تھا جس نے ابوالفضل کو اور میرے شیر افگن خان کو قتل کرا دیا تھا۔ اس نے دربار کیا اور کھڑکی اتنی نیچی بنائی کہ سر جھکا کے آنا پڑتا۔ شیخ احمد سرہندی بیٹھ کے اس طرح آئے کہ پہلے ان کے پیر دربار میں داخل ہوں۔ اور جو سر خدا کے آگے جھکا ہے کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔

شیخ احمد سرہندی کے بہت سے مرید تھے۔ ان میں مہابت خاں بھی تھا۔ اور ہم لوگ کشمیر میں تھے کہ اس نے ہمارے لئے جال تیار کیا۔

وہاں ڈل جھیل کے کنارے فواروں کے نیچے چراغاں تھا۔ جہاں پناہ کو میں جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی۔ کھلی ہوئی فضا میں، آسمان کے نیچے راجپوت رقاصہ مارواڑی ناچ ناچ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دور پر پہاڑ برف کے تاج پہنے کھڑے تھے جو چنار جہاں پناہ نے نصب کئے تھے۔ ابھی چھوٹے چھوٹے تھے، لیکن بید مجنوں کے جھنڈ جھیل کے کنارے بہت حسین معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوتا تھا۔ کہ پورا ہندوستان ہمارے قدموں پر لوٹ رہا تھا۔ اور پیر پنجال کے برف پوش پہاڑوں

کے اس پار مہابت خاں ہمارا راستہ روکنے کی تیاری کر رہا تھا۔

اور اس ناہنجار نے اس طرح جہاں پناہ کا اور میرا راستہ روکا جیسے کوئی شطرنج میں شہ دیتا ہے۔ لیکن ادب سے شاہِ شطرنج کو پیٹتا نہیں۔ شیخ احمد سرہندی کی درویشی آخر رنگ لائی۔ میں نے بھی اس ناہنجار مہابت خاں کو بہت سمجھایا۔ مگر جہاں پناہ اس کے چنگل میں تھے، سارا ہندوستان انہیں بچانا چاہتا تھا اور نہیں بچا سکتا تھا۔ اور مہابت خاں اگرچہ صیاد تھا اس کی مجال نہیں تھی کہ اپنے آقا پر ہاتھ اٹھا سکے۔ میں اب وہ مہرالنسا نہیں تھی جس نے دونوں ہاتھوں سے کبوتر اڑا دیئے تھے۔ میں نے ہندوستان کی سیاسی شطرنج کے سب مہرے چل کے بالآخر بادشاہ کو بچا لیا۔

اور اسی طرح کشمیر سے واپسی میں جہاں پناہ شکار کے لیے ایک پہاڑ کے دامن میں ٹھہرے۔ میں ابھی تک اسی طرح ان کے دل پر، ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی۔ اب بھی میں شراب کا جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی۔ کہ ایک شکاری پہاڑ سے نیچے گرا۔ اور ہڈی پسلی چور چور ہو گئی۔ جہاں پناہ کی طبیعت اسی وقت سے خراب ہو گئی۔ میرے ہاتھ سے انہوں نے شراب کا جام پھر لیا مگر اب یہ نشاط کا جام نہیں تھا علاج کا جام تھا۔ مجھے حیرت تھی یہ وہی آدمی ہے جس نے ابوالفضل کو قتل کرایا، شیر افگن کو شکار کرا دیا جس نے زندہ عورتوں کی کھالیں کھچوا دیں، جس نے مردوں کو دیواروں میں زندہ چنوا دیا اس وقت ایک معمولی سے قدرتی واقعے سے اتنا متاثر تھا۔

اور پھر کوئی طاقت جہانگیر کو سنبھال نہ سکی۔ اس کی نبض ڈوبتی سی گئی، اس کے

ساتھ میرے اقبال کا سورج ڈوبتا گیا۔ سلطنت سوتیلے بیٹے کے ہاتھ آئی۔ مہرالنسا تو کبھی کی مر چکی تھی۔ اب نورجہاں بیوہ ہو کر جیتے جی مر گئی۔ وہ جو گلاب کے عرق میں غسل کیا کرتی تھی، جس نے مہابت خاں کا کفر توڑا تھا۔ یہاں تک کہ راوی کے کنارے لاہور کے قریب آرام کرنے کا وقت آگیا۔

چاندنی اسی طرح درختوں کے سبز رنگوں کو گہرا کر کے فضا میں ٹھنڈی آگ بکھیر رہی تھی۔

زرین تاج خاموش ہو گئی۔

(۴)

پھر زرین تاج نے کہا۔

میرا نام زرین تاج تھا۔ میں قزوین میں پیدا ہوئی۔ میں اتنی ذہین تھی کہ اس مردے جو میرے باپ میں تھا عورت سے صدہا سال کی رقابت سلب ہو گئی۔ اور اس نے مجھے بہت اعلیٰ تعلیم دلائی۔ جیسی ہونہار لڑکوں کو دلائی جاتی ہے۔ حدیث، تفسیر، فقہ الٰہیات میں نے مردوں کی طرح سیکھا اور مردوں سے زیادہ بہتر میں مناظرہ کر سکتی تھی۔

جب میں پڑھ لکھ چکی تو میری شادی میرے چچا زاد بھائی ملا محمد سے کر دی گئی۔ عربوں میں ابنِ عم سے عشق مشہور ہے، مجھے اپنے ابنِ عم سے ہمیشہ چڑ تھی۔ ملا محمد کو بھی علم و فضل کا بڑا دعویٰ تھا۔ مگر میں اسے چٹکیوں میں اڑاتی تھی۔ میں خود علوم میں اس قدر کامل تھی کہ مجھے کامل تر مرد کی تلاش تھی۔ ایسے مرد کی جو میرے ذہن کی گردن مروڑ سکے۔

پھر جب میں نے محمد علی باب کے حالات سنے تو اسے ایک خفیہ خط لکھا۔ وہ بہت سن رسیدہ تھا اور میں جواں سال تھی۔ لیکن میں اس کے روحانی جمال سے بن دیکھے اس کی طرف کھنچی جاتی تھی۔ ایک طاقت تھی جو اندر ہی اندر مجھ سے کہہ رہی تھی، تیری منزل وہی ہے۔ جب باب کا جواب مجھے ملا تو میں بے دیکھے اس پر ایمان لے آئی۔ کچھ روز میں نے اپنی بابیت کو پوشیدہ رکھا اور پوشیدہ طور پر اسے خط لکھتی رہی۔ جب اس کا جواب آتا تو بصیرت کی آنکھ کھل سی جاتی اور جو عورت مجھ میں تھی وہ کہتی تجھے تیرا مقام مل گیا۔

یہاں تک کہ جب باب نے دیکھا کہ علم مناظرہ اور جوش بحث میں بڑے بڑے فاضل میرے مقابل ٹھیر نہ سکیں گے تو اس نے مجھے کھلم کھلا تبلیغ کا حکم دے دیا۔ وہ جو آفتاب بصیرت تھا اس نے مجھے قرۃ العین (آنکھ کی پتلی) کا خطاب دیا۔ دوسرے بابی بھی مجھ سے بحث کرتے کرتے عاجز آجاتے۔ انہوں نے باب سے میری شکایت لکھ کر بھیجی۔ اس پر باب نے طاہرہ کا لقب دیا۔ اس لقب کو میں نے اپنا تخلص بنا لیا۔

میں نے اپنے شوہر کو بابیت کے نور سے منور کرنا چاہا۔ وہ میرے خیالات کیا بدل سکتا۔ لیکن میں بھی اس کے دل میں چراغ نور نہ جلا سکی۔ دراصل یہ مرد کے ذہن اور عورت کے ذہن کی ٹکر تھی۔ ایک عورت جو صدیوں کے بعد ابھری تھی، ایک ایسے مرد سے بیاہی گئی تھی جس کی ذہانت صدیوں کے استعمال سے فرسودہ ہو گئی تھی۔ پھر میرا شوہر شیر افگن نہیں تھا جسے میں عائشہ کے لئے دل سے چاہتی وہ خسرو پرویز تھا۔

وہی فاتحانہ ملکیت کا دعویٰ۔ اس لئے کہ نکاح کے چند کلمے پڑھا کے ہیں اسے سونپ دی گئی تھی۔ میری نس نس میں بغاوت جاگ اٹھی۔ میرے لہو کی بوند بوند میں محمد علی باب کا جگایا ہوا جادو تھا۔ میری آنکھوں نے کبھی باب کو نہیں دیکھا۔ میں کبھی اس سے نہیں ملی۔ لیکن وہ ہر وقت حاضر اور موجود تھا۔ اور اس کی موجودگی سے، اس دائمی حضور سے میرے شوہر ملا محمد کی ہستی میری نظروں میں صفر سے کم رہ گئی۔

آخر میرے شوہر نے اپنے والد اور میرے والد سے شکایت کی۔ انہوں نے مجھ پر بہت دباؤ ڈالنا چاہا میں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اپنے باپ سے میں نے کہا کہ میں طاہرہ ہوں۔ باب نے مجھے طاہرہ کا لقب دیا ہے۔ میرا شوہر حق سے منہ چھپاتا ہے۔ اور اس لئے وہ خبیث و مردود ہو گیا ہے۔ طاہرہ کا کسی خبیث سے جنسی تعلق باقی نہیں رہتا اور جنسی تعلق باقی نہ رہنا طلاق کے برابر ہے۔ پھر اپنے والد کو قائل کرنے کے لئے میں نے بحث شروع کر دی کہ کیا مکہ کی جو عورتیں ایمان لے آئی تھیں۔ مگر ان کے شوہر بدستور کافر رہے تھے انہیں رسول اللہ نے بلا طلاق دوسروں کے نکاح میں نہیں دے دیا تھا؟

اس درمیان میں میں باب سے دور تھی۔ میری آنکھیں کبھی رو رو اُس کے جمال کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔ میری روح اسے ڈھونڈتی تھی کہ اسے اپنا حال سنائے اور جب میری روح اس مردِ کامل کے لئے تڑپ رہی تھی۔ عقلِ نسوانی، مردانہ وجدان کی برق کی متلاشی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر فکرِ سخن کے دروازے کھلتے دیکھے۔ وہ مجھ سے

دور تھا اور میری روح اس کے لئے بے تاب تھی۔ وہ کہیں مجھے مل جاتا تو میں کس کس طرح سے اسے حال دل سناتی۔

گر بہ تو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

تمہارے اقبال نے اس شعر کو پسند نہیں کیا۔ غالب کی عیاشی کو بھی اس نے اپنے جاوید نامے سے نکال باہر کیا۔ لیکن باب کا تصور میری نظروں میں معشوق کا تھا۔ معشوق حقیقی کے مظہر کا اور ساتھ ہی ساتھ مکمل مرد کا جس کی روح کائنات کو آغوش میں لئے ہوئی تھی۔

دور دہانِ تنگِ تو، عارضِ عنبریں خطت
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

یہ زمانہ میرے لئے عجیب و غریب جذب و احساس کا زمانہ تھا۔ یہ عشق کا زمانہ تھا نشاط و فنا کی لہریں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتیں، کبھی مجھے قبائے دوام بخشتیں، کبھی لمحہ لمحہ نئی موت نئی لذتِ مرگ عطا کرتیں۔

اس نے مجھے طاہرہ کا خطاب دیا تھا۔ یہی میرا تخلص تھا۔ اور میں نے آبشار گرتے دیکھے۔ الفاظ کے آبشار۔ اور پھر جو میں نے آنکھ کھولی تو ان آبشاروں کی لگام میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے قرآن مجید سے شوکت لی اور متنبی کے ترنم کو قاآنی کے ترنم میں حل کر دیا۔ ایران کی خاک سے ایک ہزار شاعر اٹھے تھے۔ میں پہلی شاعرہ تھی جوان

زریں تاج

ایک ہزار شاعروں سے الگ کھڑی تھی اور میری انگلیوں کے درمیان سے یہ عظیم الشان آبشار گر رہا تھا۔

چہ شود کہ آتش حیرتے بزنی بہ قلۂ طور دل
فصلکتہ، ودکتہ، مندکدکا، متزلزلا

یہ آبشار الفاظ ہی کا نہیں تھا، ایک جہاں سوز عشق کی آگ تھی، سیال آگ جو اس آبشار سے گرتی چلی جا رہی تھی، جس کی تہ میں نیستی کے نہنگ منہ پھاڑے ہوئے تیار بیٹھے کہ مجھے اور دوسروں کو نگل جائیں۔ میں نے اپنی طرح دوسروں کو ان نہنگوں کے خروش لاسننے کی دعوت دی۔

اب آبشار کے گرجتے ہوئے تخت پر وہ جلوہ افروز تھا۔ محمد علی باب۔ اس کے چہرے کا قدس، ظہور حق کی بشارت دیتا تھا۔ جس کسی نے اس کا راستہ اختیار کیا وہ تو محنت اور ابتلا سے بچ گیا۔ لیکن جس نے اس سے سرتابی کی تو گویا وہ داورِ محشر کی طرح تختِ قیامت پر متمکن تھا، قہار اور جبار۔ کامل مرد، مجھ کو اور میرے ساتھ ساری کائنات کو سرتابی کے جرم میں فنا کرنے والا۔ قہار و جبار ہی نہیں تھا۔ اس میں رحم و لطفِ شہنشاہی کی تمام صفتیں بھی تھیں۔

کسے ارنہ کو دا نائتم نہ گرفت جبل ولائتم
کنمش بعید زسائتم وہمش بہ قہر ببب ولا
منم آں ظہور مہیمنی منم آں مشیت بے ثنی
منم آں سفینۂ ایمنی ولقد ظہرت محلجلا

شہدائے طلعتِ نارمن بدہ دید سوئے دیارِ من

سرو جاں کفیدہ نثارِ من کہ منم شہنشہ کربلا

اور باشوکت، باعظمت، گرجدار آبشار تھا کہ بلندیوں سے گرتا ہی جاتا تھا۔ عرش سے فرش تک۔ جلال سے جمال تک۔ اس کی ہمہ گیر مستی سے میرے حساس ذہن تک۔

طیر العماء تکشفت، ورق البہاء تصعصفت

ذلک الضیاء درقت متجلاً متجلا

اس سیلاب، اس آبشار میں میرا شوہر ملّا محمد قزوینی خس و خاشاک کی طرح بہ گیا۔ میں اب بڑے انہماک سے بابیت کی تبلیغ کرنے لگی تھی۔ جب قزوین میں مزاحمتیں بہت بڑھ گئیں تو میں کربلا چلی گئی۔ تقریر میں جوش اور سرور کے عالم میں، میں اکثر چہرے سے نقاب الٹ دیتی۔ اور وہ جو مجھ سے بڑی بڑی عالمانہ بحثیں کرتے ہوتے میرے ذہن کے تمام حربوں کے بعد حسن کے اس حربے سے اتنے مسحور ہو جاتے کہ بحث کرنا بھول جاتے۔ یہ وہی زلیخا اور زنانِ مصر والی ترکیب تھی۔ آخر میں عورت تھی۔ عورت کا آخری حربہ کیوں نہ استعمال کرتی۔

بدر النساء کی مصیبت کے مصنف نے اتنا غلط نہیں لکھا کہ میں آہستہ آہستہ پردہ توڑ رہی تھی۔ براؤن سے صبحِ ازل نے محض میری مروّت میں کہہ دیا ہوگا کہ میں پردے کی پابند تھی۔ لیکن میرا کام تو تمام پابندیاں توڑنا تھا۔ فرہاد کی پابندیاں، شیریں کی پابندیاں یعنی تخلیقِ جمال کی پابندیاں، اور موضوعِ جمال کی پابندیاں۔ میں نئے باب کی روحانیت

کے ساتھ مزدک کی تعلیم کو حل کر دیا۔ میں اپنے ہی محاذ پر لڑتی رہی۔ باغی عورت کے محاذ پر۔ ابھی تک تو وہ جماعت نہیں بنی تھی اور قوام السلطنت نے نہ وزارت کی تھی نہ نکالے گئے تھے۔ لوگ جمال الدین افغانی کا نام ڈر ڈر کے لیتے تھے۔ میری طرح وہ بھی ایک متعصب کافر باغی تھا۔ دونوں نے ناصر الدین شاہ قاچار کو للکی تھی۔ اور دونوں کا کام بادشاہوں، پرویزوں، جہانگیروں نے تمام کیا۔ وہ مردوں کی جمہوریت کے محاذ پر لڑا، میں روحانی جمہوریت اور عورت کی آزادی کے محاذ پر لڑتی رہی۔ میں مزدک کی ہم خیال تھی کہ کیوں عورت ایک ہی مرد کی پابند بنا دی جائے ممکن ہے کہ اس کا مرد مُلا محمد قزوینی جیسا خشک نوجوان ہو۔ نقاب کے شگاف کو میں نے اور زیادہ چاک کر دیا تاکہ عورت کی صورت ——— اور اس کے داغ اچھی طرح پہچانے جا سکیں۔

جب میں کربلا سے نکالی گئی تو بغداد پہنچی۔ وہاں سے نکالی گئی تو کرمان شاہ اور ہمدان ہوتی ہوئی پھر قزوین واپس آ گئی۔ اب باب کا جمال میری ہستی میں اس قدر بس چکا تھا اور اپنے شوہر سے میری نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں نے بابیوں کو فتوے دے دیا کہ وہ میرے شوہر مُلا محمد اور اس کے باپ مُلا تقی کو قتل کر دیں۔

اور اس طرح جیسے تمہارے ملک میں ہوتا ہے ذرا سا اشارہ پاتے ہی انہوں نے میرے خسر کو نہ صرف قتل کیا بلکہ ناک کان کاٹ کے اس کی لاش کو مسخ کر دیا۔ اب سارا قزوین میرا اور تمام بابیوں کا جانی دشمن تھا۔ لوگ مجھے قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے میں نے چھپ چھپا کے خراسان کا رخ کیا۔ جہاں شاہِ ایران کے خلاف بغاوت عروج

پر تھی۔

راستے میں مجھے محمد علی بار فروشی ملا محمد علی باب میرے لئے مرد کی روح اور وجدان تھا۔ محمد علی بار فروشی مرد کا ذہن اور جسم۔ اور تم نے بہت سے قصے تو سنے ہوں گے۔ کیونکہ آوارگی کے قصے عورت کی زندگی میں شروع ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے۔

سبز درختوں کے گھرے سائے میں زریں تاج قدم سے قدم ملائے ارشد کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اپنی داستان سناتی ہوئی نقاب الٹی ہوئی تھی، اس کا چہرہ چاند کی روشنی میں چاند سے زیادہ بے جان اور ٹھنڈا معلوم ہو رہا تھا۔ ارشد نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے اور محمد علی بار فروشی کے درمیان کیا واقعہ پیش آیا۔ کیا سچ مچ اس کے جسم سے تمہارے جسم کو محبت تھی۔ تم جو غائبانہ طور پر تمام عمر محمد علی باب کی روح کی شیدا رہیں۔

وہ مسکرائی۔ چاند کی سی ٹھنڈی مسکراہٹ جس سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کرے پر زندگی کے آثار ہیں یا نہیں۔ اور کہنے لگی۔ "خدا جانے جب تم نے کسی عورت کے متعلق ایسا کوئی الزام سنا ہے تو کیا تم کبھی یقین سے کہہ سکتے ہو کہ یہ الزام صحیح ہے یا غلط۔ صرف ملزم عورت اور ملزم مرد جانتے ہیں کہ یہ کتنا صحیح ہے اور کتنا غلط۔ اور کبھی کبھی جو واقعہ پیش آ چکا ہے غلط معلوم ہوتا ہے اور جو پیش نہیں آیا ہے صحیح معلوم ہوتا ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ میں اس سے بارہا ملی۔ خلوت کی ملاقاتیں۔ باب میرے لئے محض روح تھا۔ ملا محمد محض جسم، محض ہوس۔ محمد علی بار فروشی ان دونوں کے درمیان تھا

ذی روح جسم، جسم کے اندر جان۔ میں اس سے بے حجاب ملتی رہی۔ اگر کوئی ان ملاقاتوں کو ناجائز کہتا ہے، فاسقانہ قرار دیتا ہے، قرار دے لے۔ مجھے ایسے مرد کے جسم کی ضرورت تھی جو میری ٹکر کا ہو۔ جس سے مل کے میں اپنے آپ کو اس سے بدتر نہ سمجھوں۔ اس کے علاوہ میں عورت تھی۔ عورت کے جسم میں مجھے مرد کے جسم کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

یہاں تک کہ قزاقوں نے قافلہ لوٹا اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ میں گرفتار ہو کے طہران آئی۔ یہاں میں افواہ اور افسانہ بن گئی۔ شیریں کی طرح، نورجہاں کی طرح لوگوں نے مجھ اسیر زنداں کو طہران کی گلیوں میں دیکھا۔ ہارون الرشید کی طرح۔ میری شہرت سن کے ناصرالدین شاہ قاچار جہانگیر بن گیا۔ گویا میں نے روحانیت کا دوسرا کبوتر بھی نورجہاں کی طرح بڑے بھولے پن سے اڑا دیا تھا۔ لیکن میں جو کبھی نورجہاں تھی نورجہاں کی زندگی سے سبق لے چکی تھی۔ میرا شیر افگن محمد علی بارفروشی مجھ سے چھن چکا تھا۔ مگر میں شراب کے ایک پیالے کے عوض کسی شہنشاہ کی سلطنت خریدنا نہ چاہتی تھی۔ جمال الدین افغانی کی طرح اپنے سوتیلے رفیق کی طرح میری زندگی کا مقصد بھی شہنشاہوں کے تختے الٹنا تھا۔ فرہاد کے تیشے کو زمین کی گہرائی میں دفن کرنا تھا۔ ناصرالدین شاہ نے جب مجھے اپنی خاص الخاص ملکہ، اپنی نورجہاں بنانا چاہا تو میں ہنسی۔ ایک شعر جو میں نے بڑی عقیدت سے انکسار و عجز کے عالم میں باب کے لئے لکھا تھا، اب استغنا و طنز کے عالم میں شہنشاہ کو لکھ بھیجا۔

تو و ملک و جاہِ سکندری، من و رسم و راہِ قلندری
اگر آں خوش است تو در خوری، وگر ایں بد است مرا سزا

اور ظاہر ہے کہ اس جرأتِ انکار کی سزا مجھے کیسے نہ ملتی۔ میں بڑی بے دردی سے قتل کی گئی۔ اپنی موت کا مزا اور اس کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔ باغ میں گانٹ سے میرا گلا گھونٹ دیا گیا۔ یا مجھے کنوئیں میں دھکیل دیا گیا اور کنوئیں کو پتھروں سے پاٹ دیا گیا یا میری زلفیں چاروں طرف سے کاٹ ڈالی گئیں اور باقی بالوں کو خچر کی دم میں باندھ کے گھسیٹتے ہوئے مجھے دارالقضا لے گئے۔ غرض ہم ایرانی بھی تم ہندوستانیوں سے کم وحشی نہیں۔

(۵)

پھر زور سے سائرن بجا۔ اور دفعتاً رک گیا۔ یہ وہ ہوائی جہاز تھا جو چوری سے لڑائی کا سامان لایا کرتا تھا۔ چند منٹ بعد پھر سائرن کی دلدوز چیخ سنائی دی، اور سکرات کی طرح اکھڑے ہوئے سانس کی طرح سنائی دیتی رہی۔ دو ہوائی جہاز دیکھ بھال کی اڑان کرنے کے لئے دور پہ دو سبز اور سرخ نقطوں کی طرح پرواز کر رہے تھے۔ قریب ہی گھڑگھڑاہٹ کی آواز آئی سڑک پر۔ یہ اس کی اپنی جیپ تھی۔ بالآخر شیخ احمد اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

زرین تاج مسکرائی۔ چاند کی پھیکی موہوم مسکراہٹ۔ چاند میں پانی نہیں ہوتا۔ اس لئے زندگی نہیں ہوتی۔ زرین تاج ایک خاص تمدن کی پیداوار تھی۔ اگرچہ کہ وہ اس سے

آگے آگے رہی۔ اب اس جیپوں کی دنیا میں اس کا کیا کام تھا۔ وہ جو اعلیٰ ترین فارسی شعر لکھتی تھی۔ اب گویا ایک کا چستانی سُرالاپ رہی تھی۔ تم اونچی سڑک پر جاؤ میں نیچی سڑک سے جاؤں گی۔ دوراہہ آچکا تھا۔

وہ تو ماضی کی طرف چلی گئی۔ چاندنی میں غائب ہو گئی۔ اور ارشد نے جیپ میں بیٹھ کے محسوس کیا کہ اس کے لئے مستقبل ابھی بہت بہت دور تھا۔

○

تصوّرِ شیخ

جاڑوں کے دن تھے۔ میاں واجد نے کرتے کے دامن سے اپنی سُڑسُڑ بہتی ہوئی ناک پونچھی۔ صدری کا بیچ کا بٹن ٹوٹ گیا تھا۔ ایک ہاتھ اپنی صدری کے اندر ڈال کے جسم کھجانے لگے۔ دوسرے ہاتھ سے خشخشی بالوں سے بھرا ہوا، کالا کیسرو سر کھجایا۔ میاں واجد کی عمر اب کوئی چودہ سال کی ہوگی، مگر ان کے کالے چیچک زدہ چہرے پہ جوانی کی بہار صرف کالے بدنما رونگٹوں کی شکل میں نمودار ہوسکی تھی۔

آمنہ باجی ان کی بڑی پھوپھی زاد بہن کی آواز باورچی خانے سے آئی۔ "واجد ذرا منہ ہاتھ تو دھو۔ آدمی بنو۔ تمہارے بھائی درگاہ شریف سے آتے ہوتے ہونگے ......ارے سکینہ او سکینہ چل بیٹا جلدی سے دسترخوان بچھا۔"

میاں واجد نے پھر آنکھیں ملیں۔ صبح اٹھنے اور حوائج ضروری سے فارغ

ہونے کے بعد سے اب تک وہ برابر سر کھجانے اور آنکھیں ملنے میں مصروف تھے۔ پھر باورچی خانے جا کے انہوں نے آمنہ باجی سے گرم پانی مانگا۔ اس نے اپنے میلے بادامی دوپٹے سے کیتلی پکڑ کے تھوڑا سا پانی ان کے لوٹے میں ڈال دیا۔ یہ باورچی خانے کے آگے ہی موری کے کنارے پیڑھی بچھا کے دانت مانجھنے لگے۔ اور کوئلے کی سیاہی سے تھوڑی ہی دیر میں ان کے دانتوں کی رنگت بھی ان کے چہرے کی سی ہو گئی۔

یہ موری گھر کے اندرونی آنگن میں بڑی خصوصیت رکھتی تھی۔ باورچی خانے، غسل خانے، پاخانے سب کی غلاظت اسی سے ہوتی ہوئی بہتی تھی۔ اور اس کا رنگ بدلتا جاتا تھا۔ گرمیوں میں تو خیر اس کی بدبو ناقابلِ برداشت ہوتی لیکن جاڑوں میں بھی سوائے اس گھر کے رہنے والوں، مکھیوں اور کلبلاتے ہوئے کیڑوں کے کوئی اس موری کو نظر بھر کے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ غزل کے پہلے اور دوسرے مصرعوں کی درمیانی خالی جگہ کی طرح یہ آنگن کے بیچوں بیچ بہتی تھی۔ اور گرمیوں میں جب پلنگ باہر ڈالے جاتے تو بھی یہ کسی کے سرہانے بہتی کبھی کسی کے پائنتانے۔ اس گھر کے رہنے والوں کو اس سے مفر نہیں تھا جس طرح شاعر کو قافیے اور ردیف سے نجات نہیں۔

گھر کی ساخت وہی تھی جو وسط یو۔پی کے دیہاتوں میں عام ہے۔ سڑک کے کنارے دو کمرے تھے۔ جن پر چونا پڑا تھا۔ دونوں صاف تھے۔ دونوں میں تخت بچھے تھے اور تختوں پہ گاؤ تکیہ اور چاندنی کا فرش تھا۔ ان میں سے ایک دیوان خانہ تھا، دوسرا مہمان خانہ۔ دونوں کے بیچ میں ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ اور اندر آنے کی گلیارہ ی۔

ان کمروں کے بعد مردانہ صحن آتا تھا، جس میں ایک چبوترہ تھا، جس پہ گرمیوں میں گرم گرم خاک رہتی، اور برسات میں لانبی لانبی گھانس اور طرح طرح کے کیڑے، اور کبھی کبھی ایک آدھ گرگٹ۔ سیدھے ہاتھ پر ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ اس کے بعد ایک اور گلیاری جس پر ٹاٹ کا پرانا پھٹا ہؤا پردہ پڑا رہتا۔ اس پردے کے بعد زنانہ آنگن تھا، جس میں یہ مشہور و معروف موری بہتی تھی۔ زنانے صحن میں تین طرف دالان تھے۔ اور ہر دالان کے ساتھ دو دو کوٹھڑیاں۔ اور ایک طرف جدھر ٹاٹ کا پردہ تھا، اُدھر باورچی خانہ، غسل خانہ وغیرہ۔ اسی گھر میں چودہ سال پہلے میاں واجد نے آنکھیں کھولی تھیں۔ ان کی زچگی ایک اَن پڑھ گنوار سی دایہ نے کی تھی۔ کسی نے ان کی آنکھوں میں سلور نائٹ ریٹ نہیں ڈالا۔ ان کی ماں اسی زچگی میں سیپٹی سیمیا ہو کے ختم ہو گئیں۔ گھر بھر کی عورتوں کا عقیدہ تھا۔ کہ اُدھر باہر کے آنگن میں جو سوکھا، مرجھا سا انار کا درخت ہے۔ یہ اس میں رہنے والی پریوں کی کارستانی تھی۔ واجد کے چچا زاد بھائی سید بسم اللہ شاہ، معروف پریوں سے زیادہ مشیت ایزدی کو اپنی بیوی کی نمانی کی اس بے وقت موت کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ اس گھر میں یا خدا پر عقیدہ تھا یا پریوں، بھوتوں اور جناتوں پہ۔ ابھی تک کوئی انسان سے واقف نہ ہونے پایا تھا۔

درگاہ شریف میں محض پریوں کا نہیں چڑیلوں کا بھی علاج ہوتا تھا۔ بیسیوں عورتیں دیوانیوں کی طرح قبروں کو پھلانگتی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک دوڑتیں، اور دیواروں پہ دوہتڑ مارتیں۔ جو زیادہ "چڑیل" قسم کی چڑیلیں تھیں۔ وہ

دیواروں اور قبروں سے سر پھوڑتیں۔ یہ سب عورتیں اپنے ظالم خاوندوں یا ظالم تر ساسوں اور نندوں سے بھاگ بھاگ کر آئی تھیں۔ بعض ڈھونگ رچائے تھیں بعض کا ڈھونگ ہسٹریا بن گیا تھا۔ کہیں کہیں وہ ہلکا سا خط عبور ہو گیا تھا جو ہوش اور سچ مچ کی دیوانگی کے درمیان ہے۔ بہت سی عاشقوں کے تلاش میں گھروں سے بھاگ بھاگ کر آئی تھیں۔ یہاں سب کی مراد پوری ہوتی تھی۔ مشرقی دیوار کے قریب "گرھائی" تھی یہ ایک گڑھا سا تھا۔ جب کوئی چڑیل اس کڑھائی میں جا گرتی، تو حضرت صاحب کے غضب سے جل کر راکھ ہو جاتی، اور جس عورت پر اس نے قبضہ کیا تھا۔ وہ تھکی تھکائی لیکن بھلی چنگی ہو کر نکلتی۔

سید بسم اللہ شاہ ۔۔۔ حنائی ریش، دو پلی ٹوپی، انگرکھا، چست پاجامہ، ہاتھوں میں ارضِ مقدس کی تسبیح لئے ہوئے درگاہ شریف میں فاتحہ اور اور د پڑھ کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں گھسیٹے نے ہاتھ جوڑ کے گھر والی کا حال کہا۔ "ہجور، تاویج گھول کے پلایا۔ اب تو سسری ذرا ٹھیک ہے۔" سید بسم اللہ شاہ نے تسبیح پڑھتے پڑھتے سر کے اشارے سے "اچھا" کہا۔ اور اسی طرح وظیفہ میں مشغول گھر کی طرف بڑھتے گئے۔ گھسیٹا اپنا لٹھ لئے، جس کے سرے پر تانبہ کول چڑھا ہوا تھا، مؤدبانہ پیچھے پیچھے چلا۔ تسبیح پر وظیفہ ختم کر کے سید بسم اللہ شاہ معروف اس سے مخاطب ہوئے "اچھا گھسیٹے جا۔ دو رکعت نماز شکرانہ ادا کر۔ دو پیسے کی کھٹیاں، دو پیسے کے تباشے فاتحہ دے کے درگاہ شریف میں چڑھا آ۔"

جب گھر پہنچ کے سید بسم اللہ شاہ ناشتہ کرنے دسترخوان پر بیٹھے، اور پراٹھے اور گلائے کے گوشت کے کوفتے سر جھکائے کھا رہے تھے، تو ان کی بیوی آمنہ نے چھوٹے ماموں زاد بھائی واجد کی شکایت کی "خدا کے لئے اسے آدمی بنایئے۔ کچھ پڑھایئے لکھایئے صاحبزادے ماشاء اللہ سے اتنے بڑے ہو گئے، کب تک اس طرح ٹلمبے لگاتے رہیں گے نرے کھل بترے نہ بات کرنے کی تمیز نہ اور کسی بات کا سلیقہ"

واجد سر جھکائے پراٹھے اور کوفتے کھاتا رہا۔ اور جب اس کے حصّے کے پراٹھے ختم ہو گئے تو اس نے باسی چپاتیوں سے باقی ماندہ کوفتے کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ آمنہ کے اس طرف سکینہ چپ چاپ بیٹھی نقشے توڑ رہی تھی۔ اس کی گہری سانولی رنگت، اور چھوٹے سے دہانے پر پسینے کے قطرے نمودار تھے۔ وہ میاں واجد کی بیوی بننے والی تھی۔ اسے میاں واجد سے گھن نہیں آتی تھی، شرم ضرور آتی تھی۔ اپنی بڑی آپا سے میاں واجد کی یہ شکایت سن کر اس کے ملگجے لہریا دوپٹہ کے نیچے اس کے سینے میں خفیف سا ہیجان پیدا ہوا جس کا مقصد کچھ نہ تھا محض اعصابی ہیجان تھا۔

سید بسم اللہ شاہ نے اس روز سے ارادہ کر لیا کہ اب میاں واجد کی واقعتاً تربیت ہونی چاہیئے۔ ان کو تربیت دینے کے دو طریقے تھے۔ ایک تو یہ کہ بس اب شادی کر دی جائے۔ سکینہ کا تیرھواں ہی سال تھا۔ مگر خیر دو ایک مہینے میں جوان ہو جائے گی۔ ذرا پاؤں میں بیڑی پڑے تو خود میاں واجد کو ذمہ داری محسوس ہو گی۔ دوسرے یہ کہ ان کی روحانی تربیت ہو۔ حقّے کی دو تین چلمیں خالی کر کے سید بسم اللہ شاہ معروف نے طے کیا

کہ اب میاں واجد ان کی بیعت کر سکتے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ سجادگی انہیں بیوی کے خاندان سے ملی تھی۔ اب اچھا یہی ہے کہ یہ بیوی ہی کے خاندان کو واپس چلی جائے۔ لیکن اس کے لئے میاں واجد پر کتنی کڑی محنت کرنی ہوگی۔ کتنی توجہ کرنی ہوگی۔ اس کا بھی حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف کو پورا احساس تھا۔

حقہ پی کر انہوں نے لانبا پیچ دار نیچہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور ملازم سے جو ان کے پیر دبا رہا تھا کہا۔ "کلّو، حقے کو تازہ کر کے لائیو، اور طاق میں ادھر جو دو تین پتلی پتلی کتابیں رکھی ہیں نا، ذرا مجھے لا دیجیو۔"

کلّو نے دارا شکوہ کے رسائل، حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف کو لا دیئے۔ وہ ان رسائل کا رد لکھ رہے تھے کہ ان میں بجز الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہ تھا۔ انہوں نے قلمتراش سے قلم کی نوک ٹھیک کی، بادامی کاغذ سامنے رکھ کے، بسم اللہ کہہ کے، عینک لگائی اور شاہزادۂ دارا شکوہ کی مجمع البحرین کو پڑھنا شروع کیا۔

"فقرائے ہند کے نزدیک برہما یعنی جبرائیل علیہ السلام کی عمر اور برہمانڈ کے باقی رہنے کی مدت دنیا کے اٹھارہ انج سال ہے۔ ہر ایک انج ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔"

سید بسم اللہ شاہ نے "نعوذ باللہ" کہہ کے بادامی کاغذ پر اس فقرے کے رد میں دو تین سطریں لکھیں۔ اور پھر وہ سوچ میں پڑ گئے۔ اب ان پر بسط کا عالم طاری ہونے کو تھا۔ قبض کی کیفیت دور ہوتی جا رہی تھی۔ کلّو نے حقہ لا کے رکھ دیا۔ بے خیالی میں

انہوں نے نیچہ اٹھایا اور ایک ہلکا سا کش لے لیا۔ اب اردو اور فارسی اساتذہ کے اشعار ذہن کے ایک لاجوردی بحرِ ذخار میں آبدار موتیوں کی طرح چمک جاتے، اور روح کی گہرائیوں میں جوت سی جگا جاتے۔ مجاز کے تمام پردے چاک چاک تھے۔ یہ پری محل والے دارا شکوہ کے اٹھارہ انچ اور اٹھارہ ہزار سال۔ اس کافر نفس صوفی نے وقت کی ابدیت کی کیا تحقیر کی ہے۔ دہر کو براست کہو، دہر خدا ہے۔ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں۔ آزاد کی آبِ حیات والے مرزا مظہر جانِ جاناں ابدیت کے لاجوردی بحرِ بیکراں میں معلوم نہیں کہاں غرق ہوگئے۔ ان کا ایک شعر البتہ آغوشِ صدف سے جھانک رہا تھا، جیسے سانپ کا من، جیسے اندھیرے میں کوہِ نور:۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو

یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

اپنے گھٹنے پر ہاتھ مار کے سید بسم اللہ شاہ معروف تڑپ گئے "ہا۔ہا۔ کیا بات کہہ دی ظالم نے۔ کیا بات کہہ گیا ظالم۔ کیا شعر اسے نصیب ہوگیا" اور اس کے بعد اس عالمِ بسط میں خود ان پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اب وہ سید بسم اللہ شاہ کم تھے، اور حضرت معروف بجلوی زیادہ۔ قافیوں کا سیلاب تھا کہ آتا چلا جا رہا تھا آمد ہی آمد تھی۔ وجد ہی وجد تھا۔ بسمل رہا ہے، دل رہا ہے، قاتل رہا ہے، محفل رہا ہے، خاموشیِ ساحل رہا ہے، دوریِ منزل رہا ہے، آب و گل رہا ہے۔ ہر طرف انبساط ہی انبساط تھا۔ نشاط ہی نشاط۔ روح کا رقص اور وجدان۔ ردیف

اور قافیے اور عروض اور تشبیہات اور لف و نشرِ مرتب کے ذریعہ ذرہ آفتاب سے قطرہ دریا سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ فنا تھی۔ لیکن اس میں بھی کیفِ نشاط تھا۔

حضرت سید بسم اللہ شاہ صاحب کو بجولی شریف کی درگاہ کے سجادہ نشین کی حیثیت سے تو صرف کانپور کے آس پاس کے قصبوں کے شرفا جانتے ہوں گے لیکن بحیثیت شاعر جہاں کہیں ردو بدلی اور اُردو غزل گائی جاتی تھی، ان کا نام سب کی زبان پر تھا۔ ان کا شمار چوٹی کے شعرا میں تھا

آٹھ دس ماہ بعد میاں واجد کی شادی سکینہ سے ہو گئی۔ یہ سکینہ جو شادی سے پہلے، آمنہ باجی کی طرح ان کی پھوپھی زاد بہن تھی، ان سے عمر میں سال بھر چھوٹی تھی۔ چیچک نے میاں واجد کے مقابل اس پر رحم کیا۔ اسے لڑکی سمجھ کے صرف اپنے ہلکے سے لمس سے ایک دو چھوٹے سے نشان چھوڑ کر چل دی۔ کسی ارضی اور سماوی آفت نے اس چھوٹی سی، میٹھی میٹھی، سانولی بلکہ ذرا کالی کالی صورت کو بگاڑا نہ تھا۔ جب شادی ہو گئی تو سکینہ کے سلمے ستارے کے بھاری کام کے پائینچے دار غرارے، اور لچکے سے لدی ہوئی ریشمی اوڑھنیاں میاں واجد کے لیے علمِ جمالیات کا دفتر کھولنے لگیں۔ اب تمامتر حسن ایک ریشمی غبار تھا جس میں ریشم ہی ریشم تھا، ملبوس کا، جلد کا ریشم، آواز کا تنفس کا ریشم، پسینے کی ٹھنڈک کا، دل کی دھڑکن کا ریشم۔ اب میاں واجد کا شعور بیدار ہوا۔ حواسِ خمسہ بیدار ہوئے۔ ان کی ناک جو آنگن کی گندی موری کی طرح بہتی تھی۔

اب اطمینان سے اکیلے ہی میں سرسٹر کر لیتی۔ ورنہ وہ بھی اب محتاط اور متین ہو گئی تھی۔

میاں واجد کو اپنی چھوٹی ننھی سی دلہن سے عشق تھا۔ اگرچہ ابتک عشق کا ذکر انہوں نے زیادہ تر شعراء کے دیوانوں ہی میں پڑھا تھا، جن کا حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف کے دیوان خانے کے ہر طاق پر انبار لگا تھا۔ یہ عشق کیا تھا، اگر کوئی میاں واجد سے پوچھتا تو وہ شاید کھسیانے ہو کر ہیں ہیں کرنے لگتے۔ مگر انہیں یقین تھا کہ اس قسم کی محبت میں جو انہیں اپنی چھوٹی سی ریشمی بیوی کے ساتھ ہے، اور باقی ہر طرح کی محبت میں بڑا فرق ہے۔ ان پر خطوط اور رنگ کے آہنگ کا راز منکشف ہونے لگا تھا۔ انہیں محسوس ہونے لگا تھا کہ جسم سے وابستہ اور جسم سے ماورا ایک کشش ہوتی ہے جو آگ ہی آگ ہوتی ہے۔ اور اپنے آپ کو اس آگ کا مطلب اچھی طرح سمجھانے کے لئے انہوں نے دیوانہ وار اردو اور فارسی اساتذہ کے دیوان پڑھنا شروع کئے اور ان پر اور سارے گھر پر ایک اور سربستہ راز منکشف ہوا کہ ان کے گلے میں بلا کا جادو، ان کی آواز میں بلا کا سریلا پن ہے۔ اپنے شاگرد اور ہم زلف میں سوز و گداز کی یہ ابتدائی نشانیاں دیکھ کے سید بسم اللہ شاہ معروف نے طے کر لیا کہ کہ اب تربیت کا وقت آ گیا ہے۔

خانقاہ میں قوالی کی مجلس تھی، جو عرس شریف کے ختم پر ہر سال ہوا کرتی تھی شیخ حسین قوال نے بڑے غضب کی آواز پائی تھی، وہ گاتا رہا۔ "تجلی ہے یا ناجدا ریہ"

تصورِ شیخ

سید شریف کو حال آیا۔ سید بسم اللہ شاہ معروف تسبیح پڑھتے رہے اور جھومتے رہے۔ اور کبھی کبھی ان کی زبان سے بے اختیار "ہا" نکل جاتا۔ قوالوں کے گلے بیٹھ گئے۔ چاندنیوں کا فرش باسی ہو گیا، گاؤ تکیے مسلے گئے۔ تبرّک تقسیم ہؤا۔ اور حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف گھر واپس آئے۔ ان کی بیوی آمنہ نے ان کے سر میں ناریل کا تیل ڈالا۔ اور آہستہ آہستہ دبانا شروع کیا۔ ان کے دماغ میں تازگی اور سرور سرایت کر گیا۔ ان نازک نازک ہتھیلیوں اور ناریل کے ٹھنڈے تیل کا سرور اور پھر اس کیف کے عالم میں آرزو ہی آرزو تھی۔ آرزو جو اشعار بنتی چلی جا رہی تھی۔ دو طرح کی آرزو تھی۔ آرزو کی دو متضاد کیفیتیں تھیں۔ حرکت و نمو کی آرزو اور سِرِّ فنا کی آرزو۔

ہر جنبشِ مژہ میں نہاں تیرِ آرزو
دل میں جگہ میں بس گئی تصویرِ آرزو
ہستی شہیدِ غم سہی، دل محوِ دید ہے
وہ سحرِ آرزو تھی یہ تکبیرِ آرزو

پھر قافیوں کا سیلاب آیا، اور حضرت معروف بجلوی کو بہا لے گیا۔ ان کی بیوی نے سر پر تیل کی مالش ختم کرنے کے لئے تیل کے کٹورے میں آخری مرتبہ اپنی انگلیاں ڈبوئیں، اور ان سے ان کے سر کی جلد کو اور کھوپڑی کی ہڈی کو دبا کے پوچھا "بس؟"

انہوں نے کہا "ہاں بس" اور اٹھ کے باہر مردانے میں چلے گئے۔ اور اپنی بیاض نکالی۔ کلّو نے حقہ بھر کے رکھ دیا۔

اندر آمنہ نے تیل کا کٹورا طاق پر رکھا۔ بیسن سے ہاتھ دھوئے۔ اس کے چہرے کی جھرّیاں اور اس کے سفید ہوتے ہوئے بال تھک کر اس کے چہرے پر ساکن ہو گئے۔ جیسے کسی مرے ہوئے کیڑے سے چیونٹے چمٹے ہوئے ہوں۔ اسے زندگی میں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسی گھر میں پیدا ہوئی۔ اسی میں اس کے ماں باپ مرے اسی میں اس کی شادی ہوئی۔ بس ایک اولاد کی تمنا تھی۔ خدا نے اولاد نہیں دی لیکن اس نے اپنی چھوٹی سی بہن سکینہ کو اولاد کی طرح پالا۔ وہ پیڑھی پر بیٹھی پراٹھے پکاتی رہی، شامی کبابوں میں مسالہ بھرتی رہی، نان خطائیاں بیلتی رہی۔ شب برات میں حلوے پکاتی رہی۔ زندگی کی صبح دوپہر ہوگئی۔ پھر سہ پہر آئی، اور اب شام قریب تھی۔ اس نے بہت کم اس گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔ ڈولی میں بیٹھ کے وہ عزیزوں اور برادری والوں کی تقریبوں میں شریک ہونے ضرور جاتی رہی۔ لیکن اس نے کبھی آزاد تازہ ہوا کی خنکی محسوس نہ کی۔ آسمان کی شکل اس کی نظروں میں اس کے صحن کی سی تھی۔ اور ڈولی پہ باہر جاتے ہوئے اگر کہیں سے آسمان کا کوئی کونا نظر آجاتا تو اسے حیرت ہوتی کہ آسمان اتنا بڑا ہے۔ اس نے کبھی لہلہاتے کھیت نہیں دیکھے تھے۔ وہ گنگا سے زیادہ دور نہیں رہتی تھی، لیکن کبھی اس نے گنگا کی پرشوکت روانی نہیں دیکھی تھی، جس کے کنارے اس کے آباؤ اجداد کا کارواں آکر اترا تھا۔

اور رفتہ رفتہ جیسے جیسے زندگی کی سہ پہر ڈھلتی گئی، شام آتی گئی۔ اس کے پیٹ میں درد بڑھتا گیا۔ بجولی میں شروع میں دعاؤں اور منّتوں کے ذریعہ علاج کیا جاتا تھا

پھر یونانی علاج ہوتا تھا۔ اور جب حالت بالکل بگڑ چکی تو انگریزی علاج شروع ہوتا۔ نظریہ یہ تھا کہ یہ سب وقت کی بات ہے۔ وقت آتا ہے تو خاک کی چٹکی سے شفا ہو جاتی ہے۔ وقت نہیں آتا تو ارسطو کے علاج سے بھی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی اس وقت کے نظریے میں کبھی کبھی تدبیر کی اہمیت کا خیال آجاتا اور جب دعاؤں اور نقشوں اور یونانی علاج سے فائدہ نہیں ہوا تو کانپور سے ڈاکٹر سلیم کو بلایا گیا۔ جنھوں نے پہلی نظر ہی میں یہ تشخیص کی کہ یہ سرطان ہے۔ ابھی وقت تھا اور انھوں نے حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو پٹنہ لے جائیں لیکن آمنہ کسی طرح راضی نہیں ہوئی۔ "کتنا خرچہ ہوگا۔ کتنی زیر باری ہوگی۔ ڈاکٹر یوں ہی بکا کرتے ہیں آپ خیال نہ کیجیے۔ آپ پریشان نہ ہوئیے۔"

بسم اللہ شاہ پریشان تو ضرور تھے۔ پریشان کیسے نہ ہوتے شریف آدمی تھے۔ لیکن وہ بھی تقدیر کے قائل تھے۔ مشیّتِ ایزدی بجوملی میں اور پٹنہ میں یکساں کام کرتی ہے۔ پھر آوارہ گردوں کی طرح بی بی کو دنیا بھر میں علاج کے لئے لئے پھرنے سے کیا حاصل۔ پھر ان کے نقطۂ نظر سے ازدواجی محبت میں ایک حد تک نفس دوں کی چاشنی تھی، جس کی سرکوبی ضروری تھی۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی آجاتا کہ انسان کی زندگی کی کچھ قیمت ہوتی ہے۔ خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو۔ مگر وہ یہ کہہ کے دل کو تسلی دے لیتے کہ بیوی ہی کی تو ضد ہے کہ پٹنہ نہیں لے جانے دیتیں۔ غرض پھر ڈاکٹری علاج چھوڑ کے یونانی علاج ہوتا رہا۔ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف اپنے مریدوں پر توجہ

کرتے رہے۔ سیرِ افلاک کرتے رہے۔ مقامات کی سیر فرماتے رہے۔ سلوک و معرفت کے جادے طے کرتے رہے۔ اور آمنہ میں اتنی بھی سکت نہ رہی کہ وہ اٹھ کے باورچی خانے میں آلو ہی چھیل سکتی یا اپنے میاں کے سر میں تیل ڈالتی۔ اب ہر فرض سکینہ کے سپرد تھا۔ اور میاں واجد کو ذرا ذرا کوفت تھی۔ کہ ان کی اپنی جوان جوان چھوٹی سی دلہن صبح سے لے کے شام تک باورچی خانے میں ہنکتی پھونکتی رہے۔ مگر بہرحال ضروری تھا کہ کھانا پکے۔ پیٹ کے دوزخ کا پُر ہونا ضروری تھا۔ اور جب آمنہ نے خوشامد کی "بٹیا ذرا اپنے دولھے بھائی کے سر پر تیل کی مالش کر دیا کر۔ ان کی ساری عمر کی عادت ہے۔ اب مجھ کمبخت سے بستر سے اٹھا نہیں جاتا۔ ان کے قدموں کے نیچے میری جنت ہے۔ میں قیامت کے روز خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔"

بسم اللہ شاہ معروف کو اپنے تقویٰ پر بڑا اعتماد تھا۔ بیوی کی بیماری کی وجہ سے ان کے آرام میں ہر طرح خلل پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ سوائے صبر و شکر کے کبھی ایک کلمۂ شکایت زبان پر نہ لاتے۔ ننھی سی سالی سکینہ جو ان کی شادی کے وقت صرف دو سال کی تھی، اب ماشاء اللہ بڑی ہو گئی تھی۔ وہ ان کے سر میں تیل لگاتی تو نرم نرم ہتھیلیوں اور ناریل کے تیل کی خنکی کا سرور تو ضرور محسوس ہوتا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا یہ ان کی اپنی بیٹی جیسی ہے۔

وہ دنیا کے تمام مصائب و آلام سے بے نیاز تھے۔ جو غم تھا، وہ غمِ عشق۔ غمِ عشقِ حقیقی میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ ایک بے خبری تھی جو غمِ روزگار پر حاوی تھی۔ جو

تصوّرِ شیخ

کچھ درگاہ سے مل جاتا تھا کافی تھا۔ اگر مرید کچھ دے جاتے تو یہ مزید نعمت تھی۔ بیوی بیمار سہی، چھوٹی چھوٹی باتوں کی تکلیف سہی لیکن میر تقی میرؔ اور فانیؔ کے برعکس حضرت معروف کے کلام میں یاسیت و قنوطیت کا فقدان تھا۔ اس کے نزدیک عشق میں یاس کی فراوانی میں غمِ روزگار کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے تمامتر توجہ نشاط، کیف اور انبساط پر کی تھی۔ اس نشاط، کیفیت، انبساط کی بنیاد حیرت اور بے خبری پر تھی۔ شبنم کا نزول، پھولوں کی نمود، طیور کے نغمے، یہ سب حیرت ہی حیرت کا سامان تھے۔ کسے فرصت تھی کہ وہ غمِ دنیا، اپنے، اپنے متعلقین یا اپنے گرد کے انسانوں کی مصیبتوں کی طرف توجہ کرے۔

اس درمیان میں سید بسم اللہ شاہ معروف میاں واجد کو سلوک و طریقت کے ابتدائی مراحل طے کرا رہے تھے۔

بڑا سوال اور مرحلہ یہ ہے کہ پیرِ طریقت اپنے مرید کے دل سے ماسوا کے نقوش محو کر دے۔ اس کے بغیر حقیقی کو نہیں لگ سکتی۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں پیرِ طریقت اپنے مرید کو ایک عارضی بت پرستی کے دور سے لے کے گذرتا ہے۔ آہستہ آہستہ انسان کا دل پرانے پیاروں، عقیدوں، مرکزوں سے ٹوٹتا ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں پیر اپنے مرید کے دل سے ماسوا کے خطرات نکالنے کے لئے اپنا تصور بندھواتا ہے یہ تصوّرِ شیخ ہے۔ اس میں مرید کا دل نقرہ و فرزند و زن کے بجائے مرشد کے تصور سے

وابستہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب مرید انہماک اور توجہ کی کیفیت حاصل کر لیتا ہے۔ تو مرشد آخری بت شکنی کرتا ہے۔ اور اپنے مرید کے دل سے خود اپنا نقش مٹا دیتا ہے۔ شیخ خود مرید کے دل میں تصوّرِ شیخ کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ اور پھر اسے منازلِ افلاک کی سیر کرانے لے جاتا ہے۔ اس کی توجہ کی گرمی بڑھتی جاتی ہے

تصوّرِ شیخ کے مرحلے سے کچھ عرصہ قبل میاں واجد نے شاعری شروع کی تھی۔ اس شاعری میں بڑا ترنم اور بڑی (مجازی) سوز و گداز کی کیفیت تھی۔ اب تک یہ لہریا دوپٹے والی، عطر حنا میں بسی ہوئی نوجوان ننھی سی دلہن کا عشق تھا۔ غالب نے سہل ممتنع کو بیدل کا تصوّر اور اس کا طرزِ بیان توڑ کے حاصل کیا۔ میاں واجد کو کاکوری کے اطراف کی آب و ہوا، اردو زبان، دلہن کے عشق، اور حافظ شیرازی نے شروع ہی سے تحفتاً سہل ممتنع میں کمال عطا کر دیا۔ اس کی پانچویں یا چھٹی غزل پر اصلاح کرتے ہوئے سید بسم اللہ شاہ معروف نے لکھا۔ "یہ خدا کی دین ہے۔ یہ انداز، یہ بیان بڑے بڑے کہنہ مشقوں کو نصیب نہیں ہوتا۔ ذالک فضل اللہ یعطی من یشاء"

میاں واجد کی یہ ابتدائی شاعری وصل کی شاعری تھی۔ وصل کا ذکر تو ذرا کم تھا، مگر وصل کی کیفیت نمایاں تھی۔ اس میں ان آنکھوں کا ذکر تھا جن کا طریقہ سب سے جداگانہ ہے، جو جھکی رہتی ہیں۔ مگر اس سمت دیکھ لیتی ہیں، جدھر وہ دیکھنا چاہتی ہیں۔ یہ اپنے اور "اس کے" عشق کی شاعری تھی کہ دل سامنے لا کر رکھ دیا، اب اس کے بعد نظر کا اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ ان آنسوؤں کا تغزل تھا جو مژہ تک

آتے آتے خشک ہو گئے تھے۔ یہ مزے کی شاعری تھی۔ وصل میں بھی فراق کی لاعلاج بے قراری کی شاعری، وہ کیفیت جس کو بیدل نے بڑے کمال سے بیان کیا ہے۔

همه عمر با تو قدح زدیم و نرفت رنجِ خمارِ ما
چه قیامتی که نمی رسی ز کنارِ ما به کنارِ ما

شاعری میں یہ نگاہِ ناز اور ذوقِ جاں نثاری کا زمانہ تھا۔ ابھی عاشقی خامکاری تھی۔ جمالِ ہر دم جمالِ نو بنتا جاتا تھا، تازہ خیال استوار نہیں ہونے پاتے تھے۔ معشوقہ کا وقت تو زیادہ تر باورچی خانے میں روٹیاں سینکتے، دھوبن کو کپڑے دینے، دوپٹوں کو رنگتے، آنچلوں پہ گوٹیں ٹانکتے صرف ہوتا تھا۔ اسے اپنے میاں (جو اب بجولی میں صرف گھسیٹے وغیرہ کی زبان پر واجد میاں باقی رہ گئے تھے، لیکن جو یو۔پی، بلکہ ہندوستان بھر میں حضرت واجد بجولوی کے نام سے مشہور ہونے لگے تھے) — کی ساری شاعری میں صرف ان کا ترنم پسند تھا۔ اور ایک مبہم سا خوشی کا احساس تھا کہ اس کے میاں کا یہ کہنا تھا کہ وہ ان کی شاعری کی بھی محبوبہ ہے۔ میاں سے محبت ایک طرح کا فرض تھا جس کی وہ روحانی ذہنی اور جسمانی طور پہ پابند تھی۔ لیکن سکینہ کو "عشق" کے معنی سکھانا ناممکن تھا۔ اس کی یہی ناسمجھی میاں واجد (معاف کیجیے گا حضرت واجد بجولوی) پر اس کی مشقِ ناز، اس کی جفا، اس کا ستم، اس کی بے نیازی سب کچھ تھی۔ روایت رودکی کی جوئے مولیاں حافظ کے رکناباد و مصلیٰ اور آتش کی۔

کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ" سے ہوتی ہوئی، اس گھر میں گھس آئی تھی جس میں گندی موری بہتی تھی، اور آمنہ باجی بچاری سرطان میں مبتلا زندگی کے آخری چند روز کاٹ رہی تھیں۔ لیکن واجد کو اپنی ہر لغزش سے عشق کا لطفِ یقیں پیدا تھا ہر سوچ تبسّم، یعنی سکینہ کے پان کھائے ہوئے سانولے ہونٹوں کی مسکراہٹ برقِ طور تھی۔ اس کا روئے آتشیں (جو دراصل بہت سانولا تھا) صبحِ دلبری کی طرح روشن تھا۔ اس کی رنگت کالی سہی، شاعری میں وہ سیمیں اندام تھی۔ کمر اس کی البتہ پتلی تھی۔ اس لئے موُئے کمر کو طرح طرح باندھا جا سکتا تھا۔ زلفیں (یعنی تیل میں چپڑی ہوئی چوٹی) تو سیاہ تھیں ہی۔ لبِ لعلین صرف پان کی سرخی سے لال ہو جاتے۔ مگر اس سے کیا۔ جوانی ہے، جوانی ہے، جوانی۔ اگر کبھی نظر کی حقیقت کا مقابلہ واجد دل کی حقیقت سے کرتا تو کہتا اس سے کیا۔ میں نے اسے اپنے دل میں

جو کچھ سمجھا وہ ویسی ہی ہے۔ نظر تو محض فریب ہی فریب ہے۔ نظر تو محض فانوس کی گردش ہے۔ اصلی نظر تو باطنی ہے، "چشمِ مجنوں" اسی سے لیلیٰ کو دیکھنا چاہیئے۔ حضرتِ جامی کا بے مثل شعر ہے ؎

موجبِ حسنِ تو تنہا نہ خد و خال فتاد
عشقِ ما نیز ز اسبابِ جمال است ترا

غرض واجد کا "مجازی" عشق اور ان کی مجازی شاعری ان کے شباب کے ساتھ ابھی اس والہانہ مرحلہ پر تھی کہ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف نے انہیں

تصوّرِ شیخ

راہِ طریقت میں تصوّرِ شیخ کے مرحلے میں داخل کیا۔ اب خود حضرت معروف کے تصوّر کے سوا نہیں تمام نقوش یہاں تک کہ سکینہ، اس کی جوانی، اس کے لہریے دوپٹوں، اور اس کے ریشمی حسن کا تصور بھی حرفِ غلط کی طرح مٹانا تھا۔ عشق میں یکسوئی کی ضرورت ہے۔ تمام "باطل نقش مٹ جاتے ہیں۔ عورت محبت کی چیز نہیں رہتی۔ وہ تو صرف بچے پیدا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اسی لئے تو فارسی شاعری نے عورت کا پیچھا چھوڑا، (معاذ اللہ رودکی سمرقندی نے انارِ پستان کا ذکر کیا ہے۔ کس قدر سوقیانہ مضمون ہے۔ مگر حضرت معروف بجولوی کا یہ بھی کہنا تھا کہ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے۔ دراصل انارِ بُستاں ہوگا۔ کسی شریر النفس کاتب نے دو نقطے اور بڑھا دیئے) فارسی شاعری نے عورت کا پیچھا چھوڑا، اور تصورِ شیخ کی ہو رہی ہے۔ جہاں تصوّرِ شیخ سمجھ میں نہیں آیا۔ امرد پرستی ہوگیا۔ غرض اس مرحلے پر حضرت معروف بجولوی، واجد کی ساری توجہ اپنی شبیہہ مبارک پر منعطف کرانا چاہتے تھے۔ اور اس سلسلے میں اور سب نقوش کے ساتھ سکینہ کا نقش بھی مٹنا ضروری تھا۔ اس نقش کا مٹنا اتنا آسان نہ تھا۔ یہ جنس کو روحانیت، رومان کو عرفان بنانا تھا۔ لیکن بہرحال یہ عظیم الشان رسہ کشی شروع ہو ہی چکی تھی۔

سرطان بڑا موذی مرض ہے۔ سب سے اچھی موت وہ ہے جو ہنستے کھیلتے حرکتِ قلب بند ہونے سے واقع ہو۔ یہ ہندوستانی شریف عورتوں کو پردے کے اندر نصیب

نہیں کیونکہ دق عموماً عارضۂ قلب سے بازی لے جاتا ہے۔ سرطان کی وجہ تو معلوم نہیں لیکن وہ بھی ٹاٹ کے پردے، اور چہار دیواری سے گھرے ہوئے مکانوں میں اکثر آتا ہے، جہاں منڈیر پر بیٹھے ہوئے کائیں کائیں کرتے ہوئے کوّوں کے سوا اور کوئی مہمان نہیں آتا۔ اور خانۂ دل اگر کبھی خدانخواستہ خداوندِ مجازی کے عشق سے خالی رہا تو ہمیشہ خالی رہ جاتا ہے۔ خیر بچاری آمنہ کو تو اپنے خداوندِ مجازی حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف سے بڑی محبت تھی۔ تمام عمر وہ فرض کی پابندی کرتی رہی۔ اس نے کبھی اپنی طرف سے کسی فرض میں کوتاہی نہیں کی۔ جاڑوں میں وہ راتوں کو اٹھتی تھی، اور پانی گرم کرتی تھی تاکہ اس کے میاں گرم پانی سے نمازِ تہجّد کے لئے وضو کرسکیں۔ تمام عمر وہ خدمت کرتی رہی اور مرتے وقت یہی افسوس کرتی مری کہ وہ اچھی طرح میاں کی خدمت نہ کرسکی، جن کے قدموں کے تلے اس کی جنّت ہے۔

تابوت، عود، کافور، کفن سب مرحلے طے ہو گئے۔ حضرت سید بسم اللہ شاہ نے اس صدمۂ جانکاہ کو اسی صبر کے ساتھ برداشت کیا جو بزرگوں کا شیوہ ہے۔ رفیقۂ حیات کی جدائی کے غم میں ایک دو آنسو تو ضرور ریشِ مقدس پر چھلکے، لیکن اس کے بعد دیکھنے والوں کو ان کا صبر، تحمل اور وقار دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اور میاں واجد پرتو ان کے اس ضبط اور اس تسلیم و رضا کا کچھ اتنا اثر ہوا کہ اس کی عقیدت کہیں زیادہ بڑھ گئی

لیکن کچھ ہی عرصے بعد درگاہ شریف کی خانقاہ کے نمازیوں نے۔ جن میں سے

تصویرِ شیخ

اکثر حضرت سید بسم اللہ شاہ کے مرید تھے ...... یہ محسوس کیا کہ حضرت کا جلال بہت بڑھ گیا ہے۔ نماز کے لئے صفیں ایستادہ ہوتیں۔ نیت باندھنے سے پہلے حضرت سید بسم اللہ شاہ صاحب دفعتاً شیر کی طرح پلٹتے۔ اور فرماتے "اس کو نکال دو" "اس کو نکال دو" دو دو تین تین آدمی صفوں میں سے خارج کر دیئے جاتے۔ اور نماز ختم ہونے کے بعد وہ اپنے ساتھیوں سے اعتراف کرتے کہ بے شک ان کے دلوں میں خطرات آ رہے تھے۔ شبراتی حلوائی نے اقبال کیا۔ "بھیّا ہمرے ہجرت صاحب ٹھیکے کہن۔ ہمرے دل میں آوت رہے کہ جلیبین کے گھی ماں تھوڑا سا میٹھا تیل میلائے دیں۔" میاں گھسیٹے نے جواب دیا۔ "بھیّا آکھر پیر جادے ہیں۔ کھدُ پیر ہیں۔ بجُرگن کی ہر بات سچّی ہوت ہے۔"

اپنے اس جلال سے ـــــ جو نیک نیّتی پر مبنی تھا ـــــ اگر کسی کو اطمینان نہیں تھا۔ تو خود حضرت سید بسم اللہ شاہ صاحب کو۔

ادھر اپنے شیخ، اپنے رہبرِ کامل سے واجد کی والہانہ عقیدت، پرستش اور عشق بنتی جا رہی تھی۔ سکینہ کے لہریا دوپٹہ اور اس کی نیم باز انکھڑیوں میں جمال ہی جمال تھا۔ لیکن پیر شیخ کی نرگسِ مستانہ میں جلال کی ایک شان تھی۔ یہ جلال جمال کی تکمیل اور اس کی شدتِ ظہور ہے۔ پیر شیخ کے گھنگھریالے بالوں، ان کی چوڑی پیشانی کے نیچے انکی دو طاقتور آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں میں کس غضب کی ساحرانہ جاذبیت تھی۔ بالکل

تلوار کی دھار کی طرح۔ ایک ایسی تلوار کی دھار جو ساری دنیا سے اس کا رشتہ منقطع کرنا چاہتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا یہ آنکھیں اسے کھینچ لیں گی، اپنے آپ میں جذب کر لیں گی جیسے روشنائی جاذب میں جذب ہو جاتی ہے۔ اور ان آنکھوں کے نیچے ہی سے باجبروت حنائی ریش شروع ہوتی تھی۔ یہ شیخ کا، رہبرِ کامل کا چہرہ ہر بزرگ بیشۂ طریقت کا چہرہ تھا۔ اس کی آن بان، اس کی شوکت، اس کا جلال۔ حضرتِ معروف بجولوی کی شخصیت نے واجد کے ذہن اور اس کے قلب کے گوشے گوشے کو مسخر کر لیا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ سکینہ اب محض اس کے جسم کی مہمان ہو کر رہ گئی ہے۔ اب بھی شعر سکینہ کا ذکر کرتے، مگر اب شعر کے معانی اور مطالب دو سطحوں پر حرکت کرتے۔ مجازی معنوں میں تو سکینہ اب بھی محبوبہ تھی۔ لیکن وہ تو محض تفصیل تھی، مقصودِ اعلیٰ کچھ اور تھا، جس کا پہلا مرحلہ حضرتِ معروف کا تصور تھا۔ مجاز اور حقیقت کا تضاد، اندر سے واجد کی ہستی کو کھائے جا رہا تھا۔ کاش برقِ جمال اُس قیدِ تعیّن کو پھونک دیتی جس میں سکینہ اسے گرفتار کیے ہوئے تھی۔ تصوّرِ شیخ دل کو تو مجازی محبت سے آزاد کرا رہا تھا۔ مگر نگاہیں ابھی تک زلفِ معنبر اور شانہ میں الجھ رہی تھیں۔ اس کشمکش میں ایک نظر کعبہ پر جمی تھی تو دوسری بت خانے پر۔ یہ شیخ کا ادب تھا۔ شیخ کا تصور تھا، شیخ کی آنکھوں کا سحر تھا۔ مگر آغوش سکینہ کی یاد اور سکینہ کی طلب سے بھرپور تھی۔ دونوں طرف سے مجبوری تھی۔ ایک طرف جان کی مجبوری، ایک طرف جسم کی مجبوری۔ ایک قیدِ جسم تھی، اور دوسری طرف قیدِ جان۔ شیخ کی توجہ سے کبھی کبھی ایسے مرحلے اور مقامات آتے جو مجاز

بہت دور کسی بے نام حقیقت کی طرف بہالے جاتے۔ کوئی واجد کی طرف دیکھتا، اور زمان و مکان دونوں معدوم ہو جاتے۔ تختِ رواں کی طرح دل اسے کسی ایسے مقام پر لے جاتا جہاں کوئی اور موجود نہ ہوتا۔ لیکن کون؟ اور پھر ان تجربوں کے بعد دل میں غم کی ہلکی میٹھی کسک باقی رہ جاتی۔

یہ تجربہ گذر جاتا، کھانا مزے کا نہ ہوتا، کوئی اور چھوٹی سی بات ہوتی۔ واجد اور سکینہ میں لڑائی ہوتی۔ وہ منہ پھلا کے، بان کے پلنگ کے پائینتانے، دوپٹے سے منہ چھپا کے پڑ رہتی۔ لڑائی کے بعد منانے کی منزل آتی۔ واجد اسے لاکھ مناتا، وہ نہ مانتی۔ وہ اور زیادہ روتی جاتی۔ تب وہ نسوانیت جو شاعر کے مزاج میں ہوتی ہے اپنی بیوی سے کہتی، دیکھو اگر تم نہ مانو تو ہمارا جنازہ دیکھو۔ یہ ایک بڑی انفعالی رومانی کیفیت تھی جو واجد محسوس کرتا۔ یہ کہ وہ مر گیا ہے، اس کی بیوی نے چوڑیاں توڑ ڈالی ہیں، بال بکھرے ہوئے ہیں، لہریے رنگوں کی جگہ سفید دوپٹہ ہے۔ بیوہ کا سوگ اور یہ کیفیت شاعری بن جاتی۔ اچھا جتنا ناز کرنا ہے کر لو۔ مگر جب ہم دنیا سے اٹھ جائیں گے تو کیا کرو گی۔ راتوں کو بستر سے اٹھ اٹھ کے آہیں بھرا کرو گی، پہروں اداس رہو گی۔ برسوں تمہارے چہرے کا رنگ اڑا اڑا رہے گا۔ اور جب تم کو اس کا پورا احساس ہو جائے گا کہ مرنے والے واپس نہیں آتے تو رو رو کے مغفرت کی دعا کرو گی۔

پھر ایک مرحلہ ایسا آتا کہ گھر، صحن کی غلیظ موری، دانت مانجھنے کا منجن

بیوی کے چمکتے ہوئے دانت، جو سلکِ گہر تھے، دُرِ دندان تھے، سب کچھ تھے، سب باطل معلوم ہوتے، حرفِ غلط کی طرح مٹتے ہوئے۔ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف، رہبرِ کامل، شیخ کا باجبروت چہرہ جلتے ہوئے آفتاب کی طرح سامنے آجاتا۔ سوا نیزے پر آفتاب۔ جلال الدین رومی کے قلم سے دیوانِ شمس تبریز کی بارش ہونے لگتی۔ ایک ایسا عالم نظر آتا کہ دوجہاں کا حسن نظروں سے گرنے لگتا۔ کسی نے پہلے تو چراغ جلا کے دوجہاں کا حسن دکھایا اور پھر پھونک مار کے چراغ بجھا دیا۔ اب اس ظلمت میں نور ہی نور تھا۔ جمال ہی جمال۔ خود اپنی ہستی اس جمال کی نبض بن گئی۔ اور دھڑکنے لگی۔ اپنی ہی ہستی شمع بن گئی اور جگمگ جگمگ کرنے لگی۔ کبھی بے خودی ہوتی، کبھی ہوش آتا۔ اور وہ باجبروت، باشوکت چہرہ اپنی طرف کھینچ رہا ہوتا، اوپر کی طرف، افلاک کی سیر کو لے جانے کے لئے، مقامات کی جانب رہنمائی کے لئے۔

اِدھر رہبرِ کامل، سید بسم اللہ شاہ معروف کا جلال بڑھتا جا رہا تھا۔ جوں جوں ان کا جلال بڑھتا جا رہا تھا۔ دیہاتیوں کے اعتقاد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہ کبھی واجد کو سخت سست نہ کہتے۔ ایک مرتبہ بھی انہوں نے اسے نماز کی جماعت سے نہیں نکالا۔ یہ سب تھا مگر اپنے جلال کی اس زیادتی کی وجہ سے خود حضرت معروف کو اطمینان نہ تھا۔ انہوں نے تقویٰ میں بہت شدت کے ساتھ اضافہ کیا تھا۔ اب اکثر وہ ساری ساری راتیں جاگ جاگ کر اور درود وظائف میں صرف کر

دیتے۔ انہوں نے بجائے تکیے کے اینٹوں پہ سر رکھ کے سونے کی مشق شروع کی تھی۔ اپنا کفن سلوا لیا تھا۔ خانقاہ میں بہت وقت صرف کرنے لگے تھے۔ لیکن شاعری کا چشمہ دفعتاً خشک ہوگیا تھا۔ جس طرح ان کی شاعری میں نشاط کی کیفیت منتقل ہو گئی تھی۔ جلال کی کیفیت منتقل نہ ہو سکی۔ وہ ایسا کلام زیادہ پڑھنے لگے تھے۔ جس میں جلال کا ظہور تھا، خواہ وہ کلام آئمہ تلبیس ہی میں سے کسی کا کیوں نہ ہو؟

نخلِ شمیم کہ در شعلہ دود ریشۂ ما
عافیت سوز بود سایۂ اندیشۂ ما

سکینہ ان کی چھوٹی سی سالی ان کے سر میں تیل دباتی تو پہلے تو اس لمس سے نفس پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ مگر بیوی کے انتقال کے بعد اس لمس میں ایک طرح کی کشش پیدا ہو گئی۔ یہ لڑکی کسی اور کی منکوحہ بھی تھی، میاں واجد کی۔ میاں واجد اب تصوّرِ شیخ کے مرحلے میں اپنے مرشدِ کامل کو سب ہی کچھ سمجھتے تھے۔ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف بجنوی۔ کو اپنے تقویٰ پہ بڑا اعتماد تھا۔ لیکن انہوں نے بایں سن و سال اپنی ہستی کے اندر نفسِ دل کی شورش سنی۔ انہیں ایک گھنٹہ پہلے سے انتظار رہتا کہ اب تیل دبانے کا وقت آئیگا۔ اور اب سکینہ آکر ان کے سر میں تیل دبائے گی۔ نازک نازک جواں نسوانی انگلیاں معلوم ہوتا تھا۔ اندر ہی اندر ان کے دل میں گھسی جا رہی ہیں۔ ان کی روشن پیشانی سے سجدوں کے نشان مٹا رہی ہیں۔ پھر ضمیر ملامت کرتا کہ معروف یہ لڑکی تمہارے سامنے گھٹنیوں چلتی تھی۔ تم نے اسے اپنی گود میں کھلایا ہے۔ اپنی بیٹی کی طرح پالا ہے۔ کیا سالہا سال

کا تقویٰ اشیطان اپنی ایک جنبشِ ابرو سے مٹا دے گا۔ یہ سب تھا۔ مگر اب انہیں چوبیس گھنٹے تیل دابتے ہوئے نازک نازک ہاتھوں کا دھیان رہنے لگا۔ اس دھیان کو دل سے نکالنے کے لئے انہوں نے تقویٰ میں زیادتی شروع کر دی۔ اشراق اور تہجد پہلے بھی بہت کم ناغہ ہوتی تھیں۔ اب وہ ساری ساری رات اوراد و وظائف میں گذارنے لگے۔ مگر ایک ہیجان تھا جو ان کے اور توجہ قلب کے درمیان حائل تھا۔ انہیں اس کا اطمینان تھا کہ یہ ہیجان نفسانی نہیں، لیکن اتنا ضرور تھا۔ کہ سکینہ جو پہلے محض دختر تھی، اب نیم دختر نیم دلبر بن گئی تھی۔ اس عمر میں، اور اس قدر زہد و اتقا کے بعد، طریقت کے ان تمام مراحل طے کرنے اور دوسروں کی رہنمائی کر چکنے کے بعد نسوانی شباب کا اس قدر اثر لینا، یہ خود جہنم کی بشارت تھی۔ وہ لاکھ معشوقِ حقیقی سے لو لگانا چاہتے، سکینہ کی تیل دباتی ہوئی انگلیاں اس کی نازک حنا سے لال لال ہتھیلیاں، انگلیوں کی پوریں جن میں مہندی رچی ہوئی تھی، ان کے اور اس اعلیٰ عشق کے درمیان حائل ہو جاتیں جن میں پہلے کیف ہی کیف تھا، نشاط ہی نشاط تھا۔

پھر رفتہ رفتہ نیم دختر، نیم دلبر کی دلکشی محض مہندی رچی ہوئی پتلی پتلی انگلیوں کی دلکشی نہ رہی۔ اب سکینہ کی آواز کا اتار چڑھاؤ...... اور اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ وہ تو قیامت ڈھانے لگے۔ شاعری کا سرچشمہ جو سوکھ چلا تھا۔ اس میں مجاز کی لہریں پیدا ہوئیں۔ حضرت معروف بجلوی نے کئی غزلیں لکھیں اور پھاڑ ڈالیں۔ اور

توبہ واستغفار کیا۔ لیکن سکینہ جب نظر آجاتی، باورچی خانے میں، دسترخوان پر، تیل وباتے وقت اس کے سینے کا تموّج ساری دنیا کو غرق کر دیتا۔ حالانکہ اس کا سینہ دوپٹے کی دوہری تہہ سے ڈھکا رہتا۔ ان نسوانی آتش فشانوں کے تموّج میں کوہِ طور نظر سے اوجھل رہا تھا۔ حضرت کا جلال بڑھتا جا رہا تھا، عبادت اور تقویٰ میں شدت ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن حضورِ قلب غائب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ خطرات کا الزام لگا کے اپنے معتقدیوں کو نمازیوں کی صف سے نکلوا دیتے لیکن ان کے اپنے دل میں خطرات کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

تصورِ شیخ کمال پر تھا، اب اگر سیّد بسم اللہ شاہ میں حقیقی رہنمائی کی صلاحیت باقی ہوتی، یا اگر وہ حقیقی رہنمائی کر سکتے تو ان کا فرض تھا کہ واجد کے قلب میں اپنے تصور کو پاش پاش کر دیں، اور توجہ کر کے اسے اعلیٰ مقامات کی سیر کرائیں۔ لیکن ان کی اپنی روح مفلوج ہو چکی تھی۔ معلوم نہیں انہوں نے اپنا تصور پاش پاش کرنے کی کوشش بھی کی یا نہیں۔ لیکن واجد کی گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ اسے ساری کائنات اپنے مرشدِ کامل، اپنے شیخ کی نورانی صورت سے وابستہ معلوم ہوتی تھی۔ اسی سے تمام جذبے، تمام کیف پیدا ہوتے تھے۔ وہیں مناظرِ قدرت، گل و بلبل و دُرّاج و سار، برشگال و بہار کا حسن انتہا کو پہنچا تھا۔

اور پھر ایک دن آیا۔

فجر کی نماز کے بعد حضرت سید بسم اللہ شاہ خلافِ معمول واجد پر برس پڑے۔ اسے مقتدیوں کی صف سے نکال دیا۔ ان کے جلال کا یہ عالم تھا کہ منہ سے کف جاری تھا۔ پھر جب انہوں نے نماز پڑھائی تو ان کی آواز میں حد درجہ رقت تھی۔ وہ نماز پڑھ کے بہت دیر وظائف پڑھتے رہے۔ گھر آئے بھی تو واجد سے بات نہ کی۔ ڈر کے مارے واجد نے ناشتہ ساتھ نہیں کیا اور اپنے پلنگ پر تکیہ میں منہ چھپائے روتا رہا۔ ظہر کے قریب حضرت سید بسم اللہ شاہ حوائج ضروری سے فارغ ہو کے، گھڑے سے وضو کے لئے لوٹے میں پانی بھر رہے تھے۔ اس نے دوڑ کے لوٹا ان کے ہاتھ سے لے لیا، اور پانی بھرنے لگا۔ حضرت نے غصے کا اظہار نہیں فرمایا۔ خاموش رہے اس پر ہمت کر کے واجد نے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ حضرت نے اسے اٹھا کے سینے سے لگایا۔ اس نے بھی وضو کر کے ظہر کی نماز ان کے ساتھ ادا کی۔ اور اس کے بعد حضرت نے اسے اپنے سامنے بٹھا کے سمجھانا شروع کیا۔ "واجد۔ میں نے تجھے اوپر کھینچنے کی، اعلیٰ تر مقامات تک پہنچانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن تیرا دل دنیا میں اٹکا ہوا ہے۔ تجھ میں طریقت کے راستے پر چلنے کی طاقت نہیں۔"

واجد روحانی دہشت اور ادب سے خاموش سنتا رہا۔ اور حضرت کہتے رہے۔ "عشقِ حقیقی سے پہلے دنیا کی تمام محبتیں، آرزوئیں، تمام تعلقات مٹانا پڑتے ہیں۔ تجھ میں اس کی طاقت نہیں۔ تیرا دل اپنی بیوی میں اور اپنی جوانی میں اتنا الجھا ہوا ہے کہ

تو طریقت کی راہ چلنے کے قابل نہیں۔

معلوم ہوتا تھا کسی نے واجد کے دل کا چور پکڑ لیا۔ کیا یہ واقعہ نہیں تھا کہ اس کے حواس بیوی کے رنگین ملبوس، اس کی عطر میں بسی ہوئی جوانی میں اسیر تھے۔

اس نے کہا۔ "حضرت یہ واقعہ ہے۔ کوئی بات، میرے دل کی کوئی واردات آپ کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن خدا کے واسطے مجھے بے یار و مددگار تنہا نہ چھوڑیئے میری مدد فرمایئے کہ کس طرح میں اپنے نفس کے اس جال سے چھوٹوں۔"

حضرت نے گردن جھکالی ان کی آنکھوں میں ریا کی وہ غیر معمولی چمک نمودار ہوئی جو واجد کے سوا غالباً ہر ایک کو نظر آجاتی۔ ان کے چہرے پر خون دوڑ گیا۔ ان کے گلے سے جو آواز پیدا ہوئی اس میں حیوانیت کا ذرا سا شائبہ تھا۔ لیکن واجد تو شیخ کے تصوّر کا غلام گردن جھکائے ہوئے اس کا منتظر تھا کہ حضرت کا اشارہ ہو اور وہ اپنی جان قربان کردے۔

دفعتاً حضرت نے بزرگانہ اور مشفقانہ انداز سے اس کے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ معلوم ہوتا تھا اس لمس سے جنت کے دروازے کھل گئے۔ انھوں نے کہا۔ "میاں واجد ایک صورت ہے مگر اس کے لئے بڑی نفس کشی اور بڑے صبر کی ضرورت ہے۔ تم اس امتحان میں پورے نہیں اترو گے۔"

"میں جان تک نثار کرنے کو تیار ہوں۔" واجد کی آواز میں بڑا جذبہ اور تاثّر تھا۔ اور اس کی آنکھیں اس جذبے کا اظہار کر رہی تھیں۔

یہ قربانی جان کی قربانی سے بھی زیادہ سخت ہوگی۔" حضرت کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"میں ہر قربانی کے لئے حاضر ہوں۔"

"تو سنو۔ تمہیں سکینہ کو طلاق دینا ہوگی۔ مگر میاں واجد یہ کافی نہیں۔ وہ اس گھر میں رہے گی۔ ظاہر ہے اس کا اور کون ہے اور وہ کہاں جا سکتی ہے۔ وہ طلاق کے بعد بھی کہیں اسی میں تمہارا دل نہ اٹکا رہے۔ اس لئے عدت کے زمانے کے فوراً بعد اس کا نکاح ثانی ضروری ہے۔ اگر کسی اور سے نکاح ہو تب بھی تمہارے دل سے مجازی عشق کی خلش نہیں جائے گی۔ وصل جب فرق بن جاتا ہے۔ تو اور زیادہ مہلک ہو جاتا ہے۔ محض تم کو اس عذاب سے بچانے کے لئے میں تیار ہوں کہ عدت کے بعد سکینہ سے نکاح کر لوں......"

معلوم ہوتا تھا کہ میاں واجد پہ بجلی سی گری۔ یہ بجلی اور سب کچھ جلا گئی۔ لیکن تصوّرِ شیخ اپنی جگہ قائم تھا۔

"میں بوڑھا ہوں۔ میرے لئے ہوس کا زمانہ گذر گیا۔ میں اپنے نفس کو بیس برس پہلے مار چکا ہوں۔ میرا نکاح تمہیں دنیا کے پھندے سے نجات دلانے کا محض ایک وسیلہ ہوگا۔ میں تمہاری خاطر یہ قربانی کرنے کو تیار ہوں۔ محض تمہاری خاطر۔ اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں۔ تمہیں میری جگہ سجادہ نشین ہونا ہے، اور تمہاری اصلاح اتنی مشکل ہے۔ یہی ایک صورت باقی تھی۔ اور یہ میں نے بیان کر دی۔"

میاں واجد کی ہستی کا ذرہ ذرہ اس برق سے جل اٹھا تھا، جو اُن پر کچھ عرصہ

پہلے گری تھی۔ یہ برق اس کے نفسِ دوں کو جلا گئی تھی۔ اب تحت الثریٰ سے ثریّا تک شیخ ہی کا تصور تھا۔ زہے قسمت کہ اس کی نجات اور فلاح کے لئے شیخ نے خود یہ قربانی قبول کی تھی۔ وہ شیخ کے قدموں پر گر پڑا اور کہا۔ "حضرت جو آپ کا حکم ہو۔ مجھے بسر و چشم منظور ہے۔ میں آپ کے حکم کی بنا پر اپنی بیوی کو تین بار طلاق دیتا ہوں۔"

اس روحانی لین دین میں کسی نے بچاری سکینہ سے نہیں پوچھا کہ اس کی مرضی کیا ہے۔ سب بھول گئے کہ وہ بھی جاندار ہے۔ اور اخلاق اور شریعت نے اسے بھی کچھ حق دیا ہے۔ پہلی اطلاع اسے یہی ملی کہ واجد نے اسے طلاق دے دی ہے۔ اس کے لئے مسئلہ بہت سیدھا سادا تھا۔ وہ طریقت کے پیچ و خم اور تصورِ شیخ کے طلسمی اثر سے ناواقف تھی۔ اس کے نزدیک واجد، بدشکل اور چیچک رُو نہیں بلکہ دنیا کا سب سے حسین آدمی تھا۔ کیونکہ وہ جوان تھا، اور اس کے جسم کو اس نے اپنے قبضے میں لیا تھا۔ حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف بوڑھے تھے۔ اس نے انہیں کبھی مرد سمجھ کے دیکھا نہیں تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا وہ انہیں دولہا بھائی کہتی آئی تھی۔

یہ انقلاب، یہ لین دین، یہ روحانی خرید و فروخت جو اس کے نزدیک محض جسمانی خرید و فروخت تھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ رات بھر واجد اندر نہیں آیا۔ اور وہ آتا کیسے۔ سکینہ اب اس کے لئے نامحرم تھی۔ لیکن رات بھر وہ بھی روتا رہا۔ اور فجر کی نماز کے لئے حضرت کے ساتھ خانقاہ نہ جا سکا۔ سکینہ صبح کو اس کے کمرے میں

گھس آئی۔ اور اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔" میرے پیارے۔ میری جان تمہیں کیا ہو گا۔ کہیں شریفوں میں آج تک طلاق ہوئی ہے۔ اس بڈھے کا جنازہ نکلے۔ وہ اپنی حرص میں تم کو مجھ سے چھڑانا چاہتا ہے۔"

واجد نے اس کے ہاتھ اپنے گلے سے ہٹا کے اسے ڈھکیل دیا۔" سکینہ کیا بک رہی ہو۔ تمہیں حضرت کے متعلق کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تمہاری آنکھ کا پانی بالکل مر گیا ہے۔ اب میں تمہارے لئے نامحرم ہوں۔ تمہیں میرے سامنے بھی نہ آنا چاہیئے تھا۔ صبر کرو۔ جو کچھ ہے خدا کے حکم ہے۔"

کچھ ایسی بیدردی سے واجد نے اسے ڈھکیلا تھا کہ وہ دیوار سے لگی روتی رہی۔ لیکن جب واجد کمرے کے دروازے سے باہر جانے لگا تو وہ راستہ روک کے کھڑی ہو گئی۔" میں تو تمہیں نہ جانے دونگی۔ تم میرے شوہر ہو۔ میں بھی دیکھتی ہوں کون مجھے تم سے چھڑا سکتا ہے۔ میں زہر کھا کے مر جاؤں گی۔ مگر اس بڈھے کھوسٹ سے شادی نہ کروں گی۔"

واجد نے اسے للکار کے ڈانٹا۔" خبردار مردار اگر تو نے حضرت صاحب کو کچھ کہا۔ ہٹ مجھے جانے دے۔"

اور وہ سہم کے ہٹ گئی۔ واجد کمرے کے باہر نکل آیا۔ مگر اب کو وہ طور بھی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ سکینہ نے حضرت سے جو بدتمیزی کی تھی۔ اس پر دو تین منٹ خون کھولا کیا۔ پھر کسی نے دفعتاً بحرِ منجمد شمالی کو اس کے خون میں حل کر دیا۔ طریقت' بیرِ افلاک

تصوّرِ شیخ

مقامات، جذب، کشف، سلوک، توجہ کے تمام راستے بند ہو گئے۔ تصوّرِ شیخ بے شک باقی رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ سکینہ کی صورت تھی۔ مظلوم، بے کس، بے بس، روحانی شاعری اور کیف کا دروازہ بند ہوا۔ مجازی شاعری کا دروازہ کھل گیا۔ وصل کا نہیں، فراق کا۔ "میں تو تمہیں نہ جانے دوں گی۔ تم میرے شوہر ہو۔ میں بھی دیکھتی ہوں۔ کون مجھے تم سے چھڑا سکتا ہے۔"

بے خبر چیچک رو نوجوان جو اب تک اپنی بیوی کی جوانی، اور اس کے لہریا دوپٹہ کی ترنگ میں شاعری کرتا تھا، اس کو کبھی یہ خیال بھی نہیں گذرا تھا کہ بیوی بھی جاندار ہے۔ اور وہ بھی محبت کر سکتی ہے۔ وہ اب تک اس کو روائتی "حسن" کا مظہر سمجھتا تھا۔ اور عشق کو اپنی میراث سمجھے بیٹھا تھا، جس کا رخ وہ جدھر چاہے پھیر دے مجاز کی طرف یا حقیقت کی طرف۔ اُسے جدائی کے لمحے میں سکینہ کے "حسن" کی بغاوت اس کی بے بسی، اس کا عشق یاد آگیا اور شعر کا سرچشمہ جاگ اٹھا۔ اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا۔ کہ اس سے محبّت کی گئی ہے۔ وہ محض عاشق نہیں، محبوب بھی ہے۔ کوئی چشمِ تر اس کے لئے بھی رو رہی ہے، اس کے لئے کوئی زلفِ پریشاں اور الجھی الجھی تھی۔ کسی کے نفس کا زیر و بم اسے بلا رہا تھا۔ کسی کی نظریں اس کی منّت کر رہی تھیں۔ اس کی طلب میں کوئی اپنی گھٹی ہوئی تربیت بھول کے لغزش کر رہا تھا۔ کوئی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے، اور پھر چاروں طرف دیکھ کے آہیں بھر رہا تھا۔ یہ آنکھیں خشک ہو جائیں گی۔ مگر جب اس کی یاد آئے گی۔ ان سے آنسوؤں کا سیلاب

ابل پڑے گا۔ جوشِ غم، جوشِ حیا پہ بھاری تھا۔ نازک شفاف سینہ نالوں سے زیر و زبر تھا۔ ایک آغوش خالی تھی، جو اس کے آغوش کے لئے بے تاب تھی۔ خدنگِ نظر، دُرِ دنداں، شعلۂ رُخ، تیرِ مژگاں، لبِ لعلیں سب میں معشوقانہ علامات عاشقانہ صفات بن گئے تھے۔ آنکھوں سے شبنم آگ بن کے ڈھلک رہی تھی۔ اور حسن کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور آخر میں حسن کی وہ شکست، وہ تلوار کی دھار جس کا نام فراق ہے۔ جس سے مفر نہیں۔

اور اس کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا۔

وہ نسوانی کشش کی شمع گل کر کے کوہِ طور کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ جس نے کوہ طور بنایا ہے، اس نے اسے ہمیشہ کے لئے اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا اب ایک کی جگہ دو مورتیں تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ایک مرشدِ کامل کی صورت، تصوّرِ شیخ اور دوسرے سکینہ کی آنسوؤں میں دبی ہوئی بے بس صورت اسے روکتی ہوئی۔ ان دونوں کی مقناطیسی کشش برابر برابر تھی۔ وہ نہ ادھر جا سکتا تھا نہ اُدھر۔ اور اس کے لئے ایک ہی راستہ باقی تھا۔ اس گھر سے باہر۔ ان دونوں کی پرستش میں ان دونوں سے دُور۔

اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور

اس نے جلدی جلدی دو تین جوڑے کپڑے نکالے، کچھ روپے اس کے پاس تھے وہ جیب میں ڈالے، اور گٹھڑی پیٹھ پہ لاد کے چل کھڑا ہوا۔ تین کوس پہ ریلوے سٹیشن تھا

میاں گھسیٹے راستے میں ملے اور انہوں نے پوچھا بھی ۔ "میاں کا بھوا ۔ کا ہے اتنے سبیرے سبیرے اسٹیشن جات ؟ ہم تم کا پہنچائے آئیں ؟"

اس نے آنسو روک کے انکار میں سر ہلایا ۔ اور آگے بڑھ گیا ۔

بیس برس گذر گئے ۔ اس درمیان میں اس نے پنجاب کے ایک شاعر اقبالؔ کا بھی ذکر سنا اور اس کا کلام بھی جستہ جستہ پڑھا ۔ لیکن اس شعر کے معنی اس کی سمجھ میں نہیں آئے ۔

کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذّت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات !

ایسے شعر پڑھ کے وہ کہتا "ارماں ۔ ان پنجابی ڈھگوں کو کبھی شاعری نہیں آئے گی ۔" اس کے برخلاف حضرت معروف بجلوی کا ایک ایک شعر اس کے لئے حرزِ جاں تھا ۔ ایک مرتبہ گھر سے نکلنے کے بعد پھر وہ کبھی ان کے سامنے نہیں آیا ۔ کسی شہر میں وہ ہوتا اور حضرت آنے والے ہوتے ـــــــ یوں تو حضرت درگاہ شریف کو چھوڑ کر باہر جاتے ہی بہت کم تھے ـــــــ تو وہ وہاں سے چل دیتا ۔ لیکن اس نے گھر سے نکلنے کے کچھ ہی روز بعد بڑا درد میں ڈوبا معذرت نامہ لکھا ۔ اور حضرت نے اُسے نہ دل سے معاف فرما دیا ۔ یہ بھی لکھا کہ "ہدایت من جانب اللہ ہے ۔ کسی کو نصیب ہوتی ہے کسی کو نہیں ۔ ہدایت تمہاری قسمت میں نہیں تھی ۔"

اس بیس برس کے عرصے میں شاعری میں اس کا اپنا نام حضرت معروف بجولوی کے برابر ہی برابر مشہور ہو گیا۔ اس کی شاعری رندی کی شاعری تھی۔ رندی اور بے نام، بے مقصد عشق کی شاعری۔ ہر جگہ حسن کی پرستاری۔ حسن کے "عین" کی پرستاری۔ ایسا معشوق جو ہر معشوق میں موجود ہے اور اس کا اپنا بجز غزل اور جذبۂ شعر کے کہیں مقام نہیں۔

وہ شراب پیتا رہا۔ حافظ کی طرح غالب کی طرح۔ یار لوگوں نے کہا کہ اس کے شربِ مدام کے دھوکے میں نہ آنا۔ اس نے بھی پیالے میں عکسِ رُخِ یار دیکھا ہے۔ وہ خود بھی شک کے عالم میں تھا۔ ممکن ہے ایسا ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے عشق میں حقیقت کس قدر ہے اور مجاز کس قدر۔ خبر کس قدر ہے اور بے خبری کس قدر۔ بے خبری بہر حال زیادہ تھی اور ایک حد تک افسردہ اگور تھی۔ یہ نسخہ شاعروں کے لئے افیون سے کسی قدر افضل ہے۔ اور اس سے حسن کی عجیب عجیب کیفیتیں نظر آتی ہیں۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

یار لوگوں نے غالب کو صوفی بنا دیا۔ تو پھر واجد کی شاعری کو کیوں حسنِ حقیقت یا حقیقتِ حسن کا پرتو نہ سمجھا جائے۔ پھر اس نے غالب سے زیادہ "ترنم" سے حسنِ حقیقت کا مشاہدہ کیا تھا۔ شراب میں مدہوش، ننگ دھڑنگ، سر اور پیر کا ہوش نہیں صرف حسن حقیقت سامنے تھا۔ شعری ترنم، قافیوں، بندشوں، استعاروں اور ترکیبوں سے جھلکتا ہوا حسنِ حقیقت۔ حسن ہر طرف سے امڈا چلا آتا تھا۔ نظر نظر میں، نفس نفس میں سماتا جاتا تھا۔ ایک پردہ اٹھتا تھا تو لاکھوں پردے گرتے تھے۔ لیکن یہ حسن بہر حال

تصورِ عشق

بے جہت تھا۔ کبھی ادھر سے نمایاں ہوتا کبھی ادھر سے۔ اس حسنِ حقیقت نے انسان کو الوہیت بخشی، ملکوتیت بخشی، کیف دیا، سرمستی دی۔ سب کچھ سکھایا انسان بنانا نہ سکھایا۔ ادھر سے آنسو بہ رہے تھے، ادھر سے آنسو بہتے رہے۔ اور دور سالہا سال کے اس پار مرشدِ کامل حضرت معروف بجولوی کا شاندار پر نور چہرہ، اور اس کے پاس ہی سکینہ کا بے بس، محبت میں اور نفرت میں بے بس چہرہ، سب ایک خلائے پر نور میں حل ہو جاتے۔ کئی سال ہوئے حضرت معروف بجولوی کی سکینہ سے شادی ہو چکی تھی۔ لیکن کیا ان دونوں کا وصل ان دونوں سے اس کا اپنا روحانی وصل نہیں تھا۔ اسے تمام عالم ایک ہمہ گیر مسلسل آغوش معلوم ہوتا۔ زندگی آغوش در آغوش معلوم ہوتی۔ جیب میں اگر دام ہوئے تو وہسکی ورنہ ویسی ٹھرا۔

اس کا کوئی خاص پیشہ نہ تھا۔ اس نے کئی پیشے اختیار کرنا چاہے۔ مگر شاعری کے سوا اور کسی پیشے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مشاعروں کے لئے سیکنڈ کلاس کا کرایہ۔ اور کبھی کبھی معاوضے کے روپے آجاتے، پچاس سے لے کر ڈھائی سو تک۔ یہ زیادہ تر شراب پر خرچ ہو جاتے۔ کبھی بچ جاتے تو کوئی دوست زبردستی کپڑے بنوا دیتا۔ اس کا اپنا کوئی مکان نہ تھا۔ یو۔پی بھر میں ایک شہر سے دوسرے، ایک قصبے سے دوسرے قصبے، ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں۔ وہ کسی نہ کسی کا مہمان ہو کے ہفتوں مہینوں رہتا۔ پھر میزبان یا اس کے نوکروں کی کوئی بات ناگوارِ خاطر ہوتی اور کہیں سے پیسے آجاتے تو وہ چل دیتا۔

بیس سال بیت گئے۔ حضرت معروف بجولوی کا انتقال ہوگیا۔ وہ ہفتوں روتا رہا۔ اور بالآخر سب کے کہنے سننے سے ان کے مرقدِ مبارک کی زیارت کے لئے اس نے بجولی شریف کا ارادہ کیا۔ وہ گھر نہیں گیا۔ جہاں سکینہ تھی۔ سیدھا خانقاہ شریف پہنچا۔ اپنا مختصر سا سامان ایک حجرے میں رکھوایا۔ غسل کیا۔ عطر لگایا۔ پہلے درگاہ شریف میں فاتحہ پڑھا۔ پھر اپنے مرشدِ کامل حضرت سید بسم اللہ شاہ معروف کی قبر پر حاضر ہوا وہاں پہنچا تھا کہ زندگی کے آثار معلوم ہوئے۔ وہی رعب دار نورانی چہرہ سامنے تھا تصورِ شیخ۔ کوئی اسے گلے لگا رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ "میں نے تیری تمام نالائقیوں کو معاف کیا۔" بے تاب ہو کے وہ مرقد سے لپٹ کے رونے لگا۔ جس پر حال ہی میں گچی کا منقش کام ہوا تھا، اور نئی نئی ہری چادر چڑھائی گئی تھی۔

وہ اتنا رویا، اتنا رویا کہ اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ پھر وہ اٹھا۔ میاں گھسیٹے نے کہا۔ "بھیا۔ بی بی بلاوت ہیں۔ تھکے ماندے اِتنے برس بعد گھر آئے ہو۔ جرا کھانا کھائے لو۔"

اس نے انکار کیا۔ کہا حضرت کے مرقد کی زیارت کر لی۔ اب واپس جاؤنگا۔ میری طرف سے سلام عرض کر دینا۔ لیکن میاں گھسیٹے کے ہاتھ سکینہ کا پیغام پھر آیا۔ آخر تم میرے ماموں زاد بھائی بھی تو ہوتے ہو۔ ایک وقت کا کھانا کھاتے جاؤ۔ تو کیا بگڑ جائے گا۔

وہ گھر آیا۔ باہر کا صحن طے کر کے، اس نے ٹاٹ کا وہ پردہ اٹھایا جو زنانے

تصورِ شیخ

دروازے پر پڑا رہتا ہے۔ صحن کی موری کے قریب بیچ آنگن میں سکینہ کھڑی تھی۔ اس کے بالوں پر سفیدی غالب آچلی تھی۔ اس سفیدی پر دھوپ جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ فراق کی گھڑی کی وہ بے تابی اور بے قراری نہیں تھی۔ اس کی جگہ ایک ایسا غم تھا جو بیس سال تک دل کی گہرائیوں میں بس چکا تھا۔ لیکن اس ضبط کے پیچھے اب بھی نظر بے قرار تھی، ہونٹ کانپ رہے تھے، آنکھوں سے خاموش آنسوؤں کا سیلاب بہا چلا جا رہا تھا۔ سر سے قدم تک رعشہ تھا، لرزش تھی۔ لہریا دوپٹہ کی جگہ سفید بیواؤں جیسا دوپٹہ تھا۔ ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ یہ وہ رومانی تصویر تھی جو واجد کو اپنی شادی اور شاعری کے زمانے میں اکثر نظر آیا کرتی۔ وہ زندہ تھا۔ مگر سکینہ آنسو بہا رہی تھی۔ اور باوجود اس تمام عقیدت کے جو تصورِ شیخ سے وابستہ تھی۔ ایک لمحہ کے اندر واجد پر یہ منکشف ہو گیا۔ کہ یہ آنسو، یہ رعشہ، یہ لرزش سب اس کے لئے ہے حضرت معروف بجولوی مرحوم کے لئے نہیں۔

ایک بار پھر عدت کا زمانہ گذرا۔ ایک بار پھر سکینہ سے اس کا نکاح ہوا۔ اور وہ سنبھل گیا۔ اس کی رندی ذرا ذرا کم ہوئی۔ اس کی شاعری میں نشاط اور کیف کی کیف کی کیفیت پھر سے پیدا ہوئی۔ سکینہ کے منع کرنے اور اس کی زبردستی کے باوجود شراب پھر بھی چوری چھپے پی ہی لیا کرتا۔ کیونکہ کہتے ہیں۔

چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

زہرخند

میجر رشید کا گول منگول چہرہ مسکرایا۔ سانولے موٹے ہونٹوں سے بڑے بڑے مگر ہموار دانت نمودار ہوئے۔ دونوں گالوں میں گڑھے پڑ گئے۔ اس نے اپنے بُش شرٹ کے کپڑے کا بلٹ ڈھیلا کیا۔ اور اپنے بچپن کے دوست امجد حسین پر اپنی چوٹ کا اثر دیکھنے لگا۔ دوسرے لمحے مسکراہٹ کی جگہ ایک اس قسم کی نیم سنجیدگی نے لے لی۔ جس میں مذاق اور شباب کی حسن سنجی برابر کی شریک ہوتی ہے۔

"امجد یار تم اس مرتبہ بمبئی آئے نہیں۔ وہاں ایک لڑکی تھی شیریں....."

امجد نے اس کی طرف بات کاٹنے کے لئے دیکھا۔ امجد حسین جس کے لئے زندگی میں محض دو قدریں تھیں۔ کتابیں اور عورتیں۔ ایک شوق نے اس کی بصارت کم کر دی تھی، اور دوسرے شوق نے بصیرت اور اکثر دونوں کی حد تک اس کی مطالعے کی سطحیت

چھپائے نہ چھپتی۔ بات کاٹ کے اس نے کہا۔ "کون شیریں۔ وہی پارسی لڑکی جو قلابے کے بس ٹرمینس کے پاس رہتی ہے۔"

"نہیں یار وہ نہیں۔ یہ مسلمان ہے۔ شیریں نیاز بھائی۔ کیا بتاؤں یار کیا لڑکی ہے۔ میری شادی نہیں ہوئی ہوتی تو میں اس سے شادی کر لیتا۔ کیا جسم۔ کیا آنکھیں۔ اس کا رنگ، انداز....." اور میجر کے چہرے پر کچھ وہ کیفیت نمودار ہوئی جو کسی مشاعرے میں کسی صاحبِ دل پہ کوئی چبھتا ہوا شعر سن کر طاری ہوتی ہے۔

"تم اس سے ملے کہاں؟"

"ریس کورس پر، پھر نذیر کے ساتھ۔ وہ نذیر کی بڑی دوست ہے۔"

"یار نذیر کی دوست تو وہ پارسی لڑکی ہے۔ وہی شیریں جو قلابے میں....."

"نہیں امجد میں اس پارسی لڑکی کو بھی جانتا ہوں۔ وہی نا جس کی ذرا ذرا سی مونچھیں بھی ہیں۔ مگر نہیں یار وہ تو سانولی ہے۔ ڈھل بھی چکی ہے کوئی پینتیس سال کی ہو گی۔ وہ نہیں جی۔ یہ شیریں تو اور ہی چیز ہے۔ یار بمبئی میں اس سیزن میں اس سے اچھی لڑکی تو میں نے نہیں دیکھی۔ اگر میری شادی نہیں ہوئی ہوتی تو میں ضرور اس سے شادی کر لیتا....."

امجد نے میجر رشید کو آہستہ آہستہ خیالات میں کھوتے دیکھا۔ اس کا چہرہ بحر الکاہل کے کسی نامعلوم حصے میں نامکمن جہاز کی طرح نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اور میجر رشید اس وقت دراصل اپنی ساری موجودہ زندگی پر لعنت بھیج رہا تھا۔ اس کی بیوی نزہت بی بی۔ واہ کیا نام ہے۔ صورت شادی کے وقت اچھی خاصی تھی۔ مگر کہاں وہ

کہاں شیریں میکس فیکٹر کا اعجاز سہی۔ مگر خدا میکس فیکٹر کو زندہ رکھے۔ اور اب تو نزہت بی بی کی واحد مصروفیت اس کی اپنی ماں سے بارہ گھنٹے کی لڑائی تھی۔ اور پھر اس کی اپنی بے بی آسٹن۔ خدا کی لعنت اس بے بی آسٹن پر۔ معلوم ہوتا ہے صندوق میں بیٹھے چلے جا رہے ہیں۔ کسی دن تو فورڈ وی ایٹ یا شورلٹ کا خواب پورا ہوگا۔ واہ کیا قسمت ہے۔ نہ شیریں جیسی خوبصورت میکس فیکٹر خوبصورت بیوی ملی نہ خوبصورت موٹر۔ یار و ساری زندگی بے بی آسٹن ہی میں گذر گئی۔ تاج محل، ممتاز محل کو دور ہی سے دیکھتے رہ گئے۔.....

میجر نذیر کے ساتھ امجد حسین پیٹن سی روڈ پر پیٹنٹ ہال کے قریب کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا۔ پندرہ منٹ گذر رہے آدھا گھنٹہ ہوا اور میجر نذیر نے پینتالیسویں مرتبہ اپنے پتلون کی کریز ٹھیک کی۔ حیدرآباد میں یونیفارم کی پابندی تھی۔ پوپ اور بریڈلے اور آسٹن اینڈ آف ریجنٹ سٹریٹ کے سلے ہوئے تمام گرم سوٹوں میں کیڑ لگی جا رہی تھی۔ لیڈی فرامرز اسے ٹیلرز ماڈل یا مانی کون کہتی ہے کہتی رہے۔ مگر میجر نذیر کو درحقیقت کپڑوں کا شوق تھا۔ نیا مکان بنوا چکنے کے بعد ذرا تنگدستی کے عالم میں اس نے کچھ عرصے کے لئے اپنے شوق کو برطرف کر دیا تھا۔ لیکن کپڑے پہنانے والے نوکر کو نہیں۔ میجر نذیر کے سر کے سیاہ بال برل کریم سے ہمیشہ چمکتے رہتے۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں دونوں طرف بڑی فیشن ایبل ٹیڑھی سی تراش کے ساتھ کٹی ہوئی تھیں۔ اور جوتے کا تلا اور ایڑی ذرا اونچی تھی۔ تاکہ قد اونچا معلوم ہو۔ پستہ قد آدمی یونیفارم

ہیں اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

"یہ بی ون لائن کی بسیں بمبئی بھر میں سب سے زیادہ بے قاعدہ ہیں۔" اس نے امجد حسین سے مخاطب ہو کے کہنا شروع کیا۔ اور پھر دفعتاً ایک سنہری بالوں والی اجنبی لڑکی سے خطاب کر کے اس نے جملہ پورا کیا۔ "کبھی کبھی تو ایک ایک گھنٹہ انتظار کے بعد بھی بس نہیں ملتی۔ اور کبھی یکے بعد دیگرے بسوں کی قطار لگ جاتی ہے۔"

سنہری بالوں والی لڑکی مسکرائی۔ مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ اور سڑک کی دوسری جانب دیکھنے لگی۔"

"یہ کون ہے؟" کتابوں اور عورتوں کے دلدادہ امجد حسین نے اردو میں آہستہ سے سوال کیا۔

"یہ؟" میجر نذیر نے مسکرا کے آتی ہوئی بس کی طرف دیکھا۔ "خیر اتنی دیر کی زحمت کے بعد۔ معاف کرنا۔ یہ لڑکی؟ میں خود نہیں جانتا۔ اسے کہیں دیکھا ضرور ہے۔ غالباً فرانسیسی قنصل خانے میں۔ وہاں شاید ٹائپسٹ ہو گی اور کیا جی۔"

اتنے میں بس آ ہی گئی۔ امجد کا قاعدہ تھا کہ بس میں وہ ہمیشہ کسی لڑکی کے بازو بیٹھنے کی کوشش کیا کرتا۔ اکثر وہ ہارکس روڈ سے فلورا فونٹین۔ فلورا فونٹین سے سی لائن پہ میرین ڈرائیو محض اسی لئے چکر لگایا کرتا تھا کہ کسی اچھی سی لڑکی کا ساتھ ہو جائے اور اس سے بات چیت کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر اس مرتبہ میجر نذیر کی رعایت سے اس نے اسی سیٹ پر قیام کیا جس پہ نذیر پہلے سے بیٹھ چکا تھا۔ اور کھڑکی سے

باہر کی گجراتی ساڑیوں کی بہار دیکھتا رہا۔

اس کے تین چار دن بعد کا ذکر ہے۔ جہاج محل (دراصل جہاز محل۔ لیکن یہ سورت کے کسی خوجے کی اصلاح تھی) جہاج محل میں شام کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ بس تیسرے ملے کی کھڑکی سے بیٹھے سمندر کو دیکھتے رہیئے۔ یہ کچھ پتھریلا حصّہ تھا۔ جس کے آگے نیچا سا بند باندھ دیا گیا تھا۔ مد کے عالم میں سمندر کی موجیں اس بند کو پھاند کر آتی رہتیں۔ یہاں تک کہ بند کے اندر کے حصے میں سمندر کی سطح کے برابر پانی آجاتا تھا۔ پھر جب جذر شروع ہوتا۔ تو یہ پانی معلوم نہیں کس ترکیب سے نکل جاتا۔ پتھریلی زمین مٹیالی مٹیالی کالی کالی باقی رہ جاتی اور شام کے وقت میجر نذیر اور امجد حسین دیکھتے رہتے۔ کہ کوّوں کے غول کے غول! اس پتھریلی چٹان زمین پر شور مچاتے۔ منڈلاتے رہتے کیونکہ سمندر ہٹنے سے پہلے شاید یہاں مچھلیاں یا ان کوّوں کی اور کسی قسم کی غذا چھوڑ جاتا۔

میجر نذیر نے کہا "شام کا وقت یہیں بیٹھے بیٹھے گذارنا بالکل ناقابلِ برداشت ہے"

"تو پھر چلو چلیں؟"

"کہاں"

"ہاربر بار، پیرلیس ڈائری کہیں تھوڑی دیر بیٹھ کے چلے آئیں"

"ہاربر بار جانے کے معنی وہسکی — اور وہ بھی تو کمبخت اسکاچ نہیں دیتے — اور سوڈا یا اور کسی چیز کے پیچھے دس بارہ روپے پھینکنے کے تھے۔

"نوپ" اچھے کپڑوں کے پرستار میجر نذیر نے سر ہلا کے کہا۔

"تو پھر ولنگڈن چلو۔"

"اس روز گئے تھے اور ہم تم اکیلے اُلو کی طرح ایک میز پر بیٹھے سنبوسے کھاتے اور کافی پیتے رہے۔ اور سوائے اس باؤلے پارسی کپتان جی کے کسی سے بات تک نہیں ہو سکی۔"

اور میجر نذیر نے کپڑوں کی کریز پر ایک مطمئن نظر ڈال کے کہا۔ "گاڑی میں کتنا پٹرول ہوگا۔"

"کل چور بازار سے ڈیڑھ گیلن لیا تھا۔ ایک آدھ گیلن پہلے کا ہوگا۔"

"تو چلو کسی لڑکی کو ساتھ لے کے ولنگڈن یا سی سی آئی چلیں۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھیں۔

"ولنگڈن میں تو آج ناچ بھی ہوگا۔" امجد حسین نے کہا۔

"آپ کی دعا سے خاکسار ذرا اچھا ہی ناچتا ہے۔" اور میجر نذیر نے پھر اپنے کپڑوں پر ایک نظر ڈالی۔

"لیکن کس کو ساتھ لیا جائے؟"

اور اس سوال کے ساتھ میجر نذیر نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی سیاہ کتاب نکالی جس پر سنہری حروف میں لکھا ہوا تھا۔ "ٹیلیفون نمبر ز" اس میں میجر صاحب نے اپنے ہر ملنے والے اور ملنے والی کا ٹیلیفون نمبر درج کر ڈالا تھا۔ جس زمانے میں ان کی رجمنٹ بغداد میں تھی۔ اس زمانے میں حبیبہ خرموش، اور بہت سے یہودنوں کے پتے انہوں نے لکھ ڈالے تھے۔ اس کے سوا لاہور، سرینگر، کلکتہ، لکھنؤ، حیدرآباد

منصوری، بمبئی، پونا، مدراس، بنگلور، غرض ہر اس شہر میں جہاں ان کا کچھ عرصے کیلئے قیام رہا تھا۔ انہوں نے کار آمد ملاقاتیوں، اور ان سے زیادہ لڑکیوں کے پتے درج کر لئے تھے۔

چنانچہ پہلے تو کوئینز روڈ پر کوینز کورٹ میں رہنے والی ایک اینگلو انڈین لڑکی سے انہوں نے ٹیلیفون ملایا۔ میجر رشید آ کے ٹیلیفون کے پاس کھڑا ہوا۔ اس کی عادت تھی کہ جب نذیر یا امجد اپنی کسی دوست سے ٹیلیفون پر باتیں کرتے ہوتے تو وہ ضرور آ ٹپکتا۔ ان کی باتیں سنتا اور پھر بالکل بے تعلق ہو کر چل دیتا۔ ایک دن تو اس نے امجد حسین کو بیوقوف بنانے کی اچھی خاصی کامیاب کوشش کی تھی۔ نذیر علی الصباح ہوائی جہاز سے حیدر آباد جا رہے تھے۔ کسی ضروری کام سے ان کی طلبی ہوئی تھی۔ رشید انہیں پہنچانے جوہو ایرو ڈروم گیا۔ اسے معلوم تھا کہ امجد آٹھ سے پہلے سو کے نہیں اٹھتا۔ اس دن چوکیدار نے اسے سات بجے اٹھا دیا۔ "دھنی، اُدھر ماہیم سے کوئی بائی تم سے بات کرنے مانگتا۔" اس وقت کون بائی ہوں گی اور وہ بھی ماہیم سے۔ امجد حسین کھڑبڑا کے اٹھا۔ ادھر سے ایک بھاری سی نیم زنانی آواز نے کہا۔ "میں سرلا بائی ہوں ماہیم سے بول رہی ہوں۔ میں مسٹر امجد حسین سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ مسٹر امجد حسین ہیں۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔" "کون سرلا بائی؟" امجد حسین سر کھجانے لگا۔ "میرا آپ کا بس پر ساتھ ہوا تھا۔ آپ نے مجھے اپنا ٹیلیفون نمبر دیا تھا۔ میں سرلا بائی ہوں ماہیم والی۔" "سرلا بائی سرلا بائی" امجد حسین سوچتا رہا۔ اور سرلا بائی کی نیم زنانی آواز پھر آئی۔ "میں

آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ کہاں ملوں۔" امجد حسین کو اس نیم زنانی آواز میں میجر رشید کے لہجے اور دبی ہوئی ہنسی کی ذراسی آہٹ معلوم ہوئی۔ اور اس نے کہا۔ "کیوں بے رشید کیا جوہوا یہ وڈ روم سے بات کر رہا ہے۔" ادھر سے نیم زنانی آواز نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "مسٹر حسین میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ میں آپ سے کہاں ملوں؟" امجد حسین نے جواب دیا۔ "تاج محل میں۔" آواز نے پھر کہا۔ "تاج محل میں کس جگہ؟ میں گیارہ بجے پام کورٹ میں آپ کا انتظار کروں گی۔" "پام کورٹ میں نہیں تاج محل میں آفس کے پاس، جہاں لفٹ ہے۔" لیکن زنانی آواز نے بڑے مصنوعی سریلے پن سے جواب دیا۔ "مسٹر امجد حسین، وہاں لفٹ کے پاس تو بہت سے لوگ آتے جاتے ہیں۔ وہاں آپ سے ملتے مجھے بڑی شرم آئے گی۔" "یہ سرلا بائی کون ہے؟" امجد حسین نے سوچنا شروع کیا۔ اور طرح طرح کی سانولی سلونی نیم کامیاب سینما ایکٹرسوں کی تصویریں اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگیں۔ ٹیلیفون والی آواز کا نیم زنانہ پن ایک طرح کی مردانہ ہنسی میں تحلیل ہوگیا۔ لیکن نیم زنانہ آواز پھر نمودار ہوئی۔ "تو مسٹر امجد حسین پھر آج گیارہ بجے پام کورٹ میں۔" اور امجد حسین نے چڑ کر کہا۔ "چل بے رشید یہ بتا نذیر چلے گئے یا نہیں۔" "معاف کیجئے گا میں سمجھی نہیں۔" نیم زنانی آواز نے پھر کہا اور امجد حسین نے جھنجھلا کے ٹیلیفون رکھ دیا۔ رشید کے کمرے میں جاکے دیکھا تو وہ غائب تھا۔ اس نے ایک چھٹی پر لکھا۔ "ڈیر رشید۔ ماہم سے تمہاری ایک دوست سرلا بائی نے ٹیلیفون کیا ہے۔ وہ تم سے پام کورٹ میں گیارہ بجے ملنا چاہتی ہیں۔ انکی

آواز بھی تم سے بہت ملتی جلتی ہے۔ امجد۔"

رشید نے اس وقت بھی امجد کو مشورہ دیا کہ یار وہ ہماری تمہاری دوست ہے نا ماہم والی سرلا بائی اسے لے کے ناچنے چلے جاؤ۔ ادھر میجر نذیر برابر ہلو ہلو کئے جارہا تھا۔ کوینز کورٹ والی اینگلو انڈین لڑکی کی ماں نے یہ خبر سنائی کہ وہ ابھی تک دہر دون سے واپس نہیں آئی۔ جہاں وہ نذیر سے ستمبر میں ملی تھی۔

نذیر نے اپنی چھوٹی سی ٹیلیفون کے نمبروں والی کتاب پر پھر ایک نظر ڈالی۔ اور ایک نمبر ملایا۔ "کیا میں مسٹر عباس باٹلی والا سے بات کر سکتا ہوں؟" پھر اپنے مخاطب کے لہجے کو سمجھ کر اس نے گفتگو شروع کی۔ "تم کون ہے۔ چوکیدار ہے کیا۔ اچھا چوکیدار دھنی ادھر ہے۔ اجون آفس سے نہیں آیا۔ اچھا ادھر بائی جی ہے۔ وہ بھی نہیں ہے کدھر گیا ہے۔ وہ بھی باہر گیا۔ سیٹھ کے ساتھ گیا؟ بچہ لوگ کے ساتھ گیا؟ اچھا اپنے فرینڈ کے ساتھ گیا۔" اسی چھوٹی سی کتاب کے ورق الٹتے ہوئے اس نے کہا۔ "چلو گلشن باٹلی والا بھی کہیں باہر گئی ہے۔ وہ بھی گئی۔"

پھر اس نے ایک اور نمبر ملایا۔ "مس مہرو کے پرائیویٹ نمبر سے۔ ہاں ہاں سر کلینو فرامرز کا مکان ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ مس مہرو کے پرائیویٹ ٹیلیفون سے میرا نام! میجر نذیر، رقص کے انداز میں میجر نذیر آہستہ آہستہ پیر پٹکنے لگا۔ اس نے امجد حسین کی طرف مسکرا کے دیکھا جواب ملنے میں دیر ہو رہی تھی۔ اس لئے ٹیلیفون کے چونگے پر ہاتھ رکھ کر اس نے کہا۔ "اسٹریجڈ مور پر مارسئی سے لے کر بمبئی تک میرا اس کا ساتھ

رہا۔ کیا لڑکی ہے بھائی امجد۔ اب تو بالکل بدل گئی ہے۔ اب تو زیادہ تر انگریزوں کے ساتھ...... یس ہلو ہلو...... انگریزوں کے ساتھ...... ہلو ہلو۔ ہاں مہرو۔ ڈارلنگ...... تم ہی پہچانو۔ کیا میری آواز بھی یاد نہیں؟...... ہاں ہاں...... ...... میرا نام تمہارے آدمی نے بتایا ہوگا...... نہیں؟ تم نے خود پہچانا؟...... تھینک یو ڈارلنگ۔ صدیوں سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کتنے دن ہوئے دو ہفتے...... مہرو ڈارلنگ کاش پھر اسٹریتھ مور پہ میرا اور تمہارا ساتھ ہوتا۔ وہی ۱۹۳۷ء کی طرح...... ڈارلنگ...... اچھا سنو مہرو۔ یہاں میرے ساتھ میرے ایک دوست ہیں امجد۔ ہم ولنگڈن کلب جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ شام کسی طرح کاٹے نہیں کٹتی۔ تم چلوگی؟...... ارے...... ارے...... کیوں!...... کہاں؟ مہاراجکمار راج بھوج کے یہاں...... کاک ٹیل ڈانس...... ارے ارے ...... خیر اگر تم پہلے ہی سے وعدہ کر چکی ہو...... اچھا ڈارلنگ کسی اور دن.. ...... اچھا...... اچھا، شام بخیر مہرو۔"

"بھئی وہ تو مہاراجکمار بھوج کے یہاں کاک ٹیل پارٹی میں جا رہی ہے اور اور تو کوئی لڑکی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔" اور ٹیلیفون کا آلہ ہاتھ سے رکھ کر میجر نذیر نے کرسی کی پشت کا سہارا لے کر پتلون کی کریز پھر سے ٹھیک کی۔

رشید نے کہا۔ "شیریں نیاز بھائی کو کیوں ساتھ نہیں جاتے۔"

"نہیں رشید۔" نذیر نے کہا۔ "گذشتہ ہفتے میں نے بہت کوشش کی۔ اُس نے

باہر آنا جانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ وہ راج رتن بھائی جوہری کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ اور وہ اسے کہیں آنے جانے نہیں دیتا۔" رشید نے پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کے اور دیوار کا سہارا لے کر کہا۔

"ممکن ہے بھئی۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔" نذیر نے جواب دیا۔

"میں نے سنا بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔" امجد نے کہا۔

"خوبصورت؟ بے حد خوبصورت۔" نذیر نے جواب دیا۔

اسی طرح دیوار سے اپنی پیٹھ کو کسی قدر رگڑ کے رشید نے پوچھا۔ "نذیر گذشتہ سال تو اس سے تمہاری بڑی دوستی تھی۔"

"بڑی دوستی تو نہیں۔ اچھی خاصی دوستی تو ضرور تھی۔ اصل میں وہ اصغر مرحوم کی دوست تھی۔ مگر کیا اچھی لڑکی ہے امجد۔" نذیر نے امجد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہا۔ "قد و قامت بات چیت، کلچر، اگر وہ درحقیقت راج رتن بھائی جوہری کی داشتہ بن گئی ہے تو بڑی حیرت ہے اصغر تو اس سے شادی کرنے کو بالکل تیار تھا۔ اور کبھی نہ کبھی اس کی شادی ہو ہی جاتی۔ کیا لڑکی ہے امجد۔"

امجد نے کہا۔ "تو یار ذرا ٹیلیفون ملا کے تو دیکھو۔"

"بیکار ہے۔ وہ نہیں آئے گی۔" پھر بھی ذرا رکاوٹ کے ساتھ نذیر نے جیب سے وہی ٹیلیفون نمبروں والی کتاب نکالی۔ اور نمبر ڈائل کرنا شروع کیا۔ "ہلو..... ہلو...

کون تم ہو۔ شیریں ...... پہچانو ...... ہاں نذیر۔ میں ابھی تک بمبئی میں ہوں ...... ہاں شیریں ...... الیکشن کے بعد حیدرآباد جاؤں گا ...... شیریں تم کیسی ہو۔ آخر اس دن تم نہیں آئیں ...... اچھا پھر کب؟ ...... آج کیوں نہیں؟ ...... شیریں ہمارا ارادہ ولنگڈن کلب جانے کا تھا ...... خیر وہاں نہ سہی تاج سہی ... وہاں بھی نہیں؟ ...... کیوں؟ ...... کیا بات ہے؟ نہیں میں پوچھنا بھی نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم آج چلو۔ ہمارے ساتھ۔ میرے ایک دوست ہیں امجد ...... نہیں؟ ...... شیریں شیریں ...... یہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا ...... میں خود آؤں۔ کہاں؟ تمہارے یہاں۔ تمہارا پتہ کیا ہے۔ ذرا ٹھیرو میں لکھ لوں ...... ہاں ...... ہاں ...... ہاں ...... اچھا بھائی کھلہ کے پل کے آگے ...... اچھا میں سمجھا ...... ہاں۔ اچھا میں آتا تو ہوں شیریں مگر تمہیں ساتھ چلنا ہوگا ...... نہیں؟ ...... خیر میں آتا تو ہوں۔ میں اپنے دوست امجد کو بھی ساتھ لیتا ہوں۔ اچھا شکریہ۔ خدا حافظ۔ خدا حافظ"

بڑی ہی نرم اور سُریلی آواز میں خدا حافظ کہہ کے میجر نذیر نے ٹیلیفون کا ریسیور رکھا۔ "امجد پھر کیا ارادے ہیں۔ بھائی کھلہ کے آگے رہتی ہے۔ چلتے ہو تو چل کے مل لو۔ مگر وہ ساتھ نہیں آئے گی۔ میں نے جب زور دیا تو وہ ٹیلیفون پر کہنے لگی۔ نذیر تم زیادہ اصرار کرو گے تو میں رو دوں گی۔ معلوم ہوتا ہے وہ راج رتن بھائی والی افواہ کچھ ٹھیک ہی ہے۔"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" رشید نے کہا۔ "یا ممکن ہے اس کے والدین اسے باہر آنے جانے سے روکتے ہوں۔"

"بہرحال......" میجر نذیر نے کہا اور آئینوں کی کریز کا امتحان لینے لگا۔

"چلو۔" امجد نے کہا۔

مرکزی اسمبلی میں سو فیصد نشستیں جیت لینے کی خوشی میں اس شام بمبئی کے بہت سے مسلمان محلوں میں چراغاں تھا۔ محمد علی روڈ، بھنڈاری بازار وغیرہ میں ہر چھوٹی سی چھوٹی دوکان پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ باب پاکستان، باب محمود غزنوی اور جناح کی بڑی بڑی تصویروں پر بجلی کی روشنی اجالا کر رہی تھی۔ پنواڑیوں کی دوکان پر جمگھٹا تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے ہوٹلوں سے سستے فلمی گانے، ریڈیو، گراموفون کے ذریعے نشر ہو رہے تھے۔ سڑک پر ہزاروں آوارہ گرد چھوٹے چھوٹے ٹوپیاں پہنے ہوئے میمن، بوہرے، خوجے اور دھوتی پہنے ہوئے ہندو، تماشا تو تماشا ہی ہے تصویر چاہے گاندھی کی ہو چاہے جناح کی۔

جگمگاتی ہوئی کمانوں، قمقموں اور مجمع دیکھتے ہوئے میجر نذیر نے ایکسیلریٹر دبایا۔ بھائی کھلہ کے پل کے اسی طرف اس نے گاڑی روک لی۔ اب سستے گراموفون ریکارڈوں کا شور بہت پیچھے رہ گیا تھا

"یہاں سے راستہ پوچھنا پڑے گا۔" میجر نذیر نے ہونٹ اور دانتوں کے درمیان اپنی چھوٹی سی مونچھوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

کوئی میمن جو قریب گذر رہا تھا اسے امجد نے پکارا۔ "مولانا۔"

اور نذیر نے راستہ پوچھا۔

ایک پتلی تاریک سی گلی سے ہو کر موٹر پھر ایک ذرا چوڑی سی سڑک پر پہنچی۔ جس پر ٹرام کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی ٹرام کھڑکھڑاتی ہوئی گذر جاتی۔

"یہ تو وہ سکول ہے جس کا پتہ اس نے مجھے بتایا اور کہا تھا کہ یہیں اس کا چھوٹا بھائی ہمارا انتظار کرے گا۔"

ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا سفید قمیص اور نیکر پہنے موٹر کے قریب پہنچا۔ اور پوچھا "آپ میجر نذیر ہیں؟"

"ہاں" میجر نے ہنس کے کہا۔ اس نے اور امجد نے آئینے چڑھائے، پھر اس نے گاڑی کو قفل لگایا۔ سڑک سے آگے موٹر نہ جا سکتی تھی۔ ایک پتلی سی گلی تھی۔ جس پر پتھروں کا فرش تھا۔ اور دونوں جانب، جدید وضع کے چھوٹے چھوٹے دو دو تین تین منزل کے ایسے مکانات تھے۔ جن میں تین چار خاندان رہ سکیں۔

گلی کے ختم پر آخری مکان پر چھوٹے رہنما نے نذیر اور امجد کی طرف دیکھا۔ اتنے میں نچلی منزل کا دروازہ کھلا۔ دروازے پر "بی۔ جی۔ شیخ، بیمہ ایجنٹ" کا نام ایک تختی پر لگا ہوا تھا۔ دروازہ کھُلا اور بجلی کی روشنی کی ایک لہر آئی۔ ایک جوان لڑکی شلوار قمیص کا سفید ریشمی سوٹ اور اس پر سیاہ جارجٹ کا دوپٹہ اوڑھے کھڑی تھی۔ اس کا قد اچھا خاصا بلند تھا۔ رنگ بہت گورا، انگلیاں بھی لمبی، چہرے کی تراش لانبی لیکن خوبصورت ہونٹوں پر لپ سٹک کی بڑی ہلکی سی سرخ تحریر تھی اور برق بین السطور کی طرح اس کے

ہموار دانت ایک تبسم میں جگمگا رہے تھے۔ بال ترشے ہوئے نہیں تھے۔ لیکن پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے میجر نذیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میجر نذیر نے اس کا ہاتھ "ہو شیریں" کہہ چکنے کے بعد بھی آدھ منٹ تک اپنے پنجے میں رکھا۔ ایک اور خاتون اس لڑکی کے پیچھے کھڑی تھیں۔ اس کی ماں۔ جن کے دانت کب کے ناہموار ہو چکے تھے۔ اور ہونٹوں اور آنکھوں کے قریب جھریاں نمودار ہو چلی تھیں اور جسم بے ڈول ہو چلا تھا۔

میجر نذیر نے امجد کا تعارف شیریں اور اس کی والدہ مسز نیاز بھائی دونوں سے کرایا۔ شیریں نے امجد کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کوئی کسی دروازے سے آنے والے اجنبی کی طرف دیکھے۔ ذراسی میزبانی لیکن بڑی ہی دور سے وہ مسکرائی۔ اور پھر دفعتاً اس کی آنکھیں میلوں پیچھے ہٹ گئیں۔

اس نے نذیر اور اس کی بیوی کی خیریت پوچھی۔ اور نذیر نے شکریہ ادا کر کے پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اس کی ماں مسز نیاز بھائی مسکرائی۔ نذیر نے کہا۔ "ہم اس لئے آئے ہیں کہ شیریں کو اپنے ساتھ لیجا کے کہیں سیر کرا لائیں۔"

"نہیں نذیر تم نے وعدہ کر لیا تھا کہ نہیں بیہودہ باتیں کرو گے۔ میں باہر تو نہیں آتی۔"

نذیر نے کہا۔ "مسز نیاز بھائی آپ کو ہماری سفارش کرنا پڑے گی۔"

مسز نیاز بھائی ہنسیں، ناہموار دانت ہنسے۔ "شیریں چلی کیوں نہیں جاتی ہو۔ تھوڑی دور تک۔ ڈرائیو کے لئے۔ کب تک۔

شیریں نے تعجب اور غصے سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اور پھر مسکرا کے اس نے

کہا۔ "نہیں نذیر۔ کیوں کیا یہاں باتیں نہیں کر سکتے۔ میں نے باہر آنا جانا بالکل چھوڑ دیا ہے"

"کب سے؟ آخر کیوں!" نذیر نے پھر اس کا ہاتھ دبایا۔

مسز نیاز بھائی نے اس کے بجائے جواب دیا۔ سال بھر سے لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا ہمارے متعلق مشہور کیا۔"

شیریں نے جلدی سے کہا۔ پہلے تو یہ مشہور کیا کہ میں جنید کے ساتھ لاہور بھاگ گئی والی ہوں اور جنید اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے۔"

"یہ اور اسی طرح کی ہزاروں باتیں ہم لوگوں کے متعلق مشہور ہونے لگیں تو شیریں کے والد نے باہر آنا جانا کم کرا دیا۔

"نذیر نے کہا۔ "لیکن میں تو تم کو پانچ چھ سال سے جانتا ہوں۔ میری بات دوسری ہے۔"

"بے شک" شیریں نے پھر اپنے خوبصورت ہموار دانتوں کی بجلی لہرا کے کہا۔ "لیکن نذیر میری تم سے درخواست ہے، التجا ہے، باہر چلنے کے لئے مجبور نہ کرو۔ اس کے علاوہ مجھے ولنگڈن سے نفرت ہے۔"

"خیر ولنگڈن نہ سہی سی سی آئی سہی۔"

"اوہ نذیر" وہ کھلکھلا کے ہنسی۔ "وہ ولنگڈن سے بدتر ہے۔"

"پھر تاج سہی۔ چلو ہاربر بار میں تھوڑی دیر بیٹھو۔"

شیریں نے صوفے پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ سیاہ جارجٹ کا دوپٹہ انچ بھر

ڈھلک گیا۔ دونوں ہاتھوں کی پانچ پانچ انگلیاں ہتھیلیاں سمیت اس نے انکار میں اس طرح ہلائیں جیسے دو گورے گورے سانپ ساتھ ساتھ اپنے پھن ہلائیں۔

یہ دیکھ کر کہ امجد بالکل خاموش بیٹھا تھا، نذیر نے کہا۔ "مسز نیاز بھائی یہ میرے دوست امجد حسین بہت اصرار کر رہے تھے کہ شیریں کو ساتھ لے چلو۔ یہ وہاں حیدر آباد میں فولاد کی انڈسٹری میں ہیں۔ میرے بڑے خاص دوستوں میں سے ہیں۔ بمبئی میں انہیں زیادہ لوگ نہیں جانتے۔ اس لئے اگر شیریں میرے اور ان کے ساتھ جائے تو کیا ہرج ہے۔"

"جاتی کیوں نہیں ہو۔" شیریں کی ماں نے دفعتاً سفارش کا پورا ارادہ کر کے اپنی بیٹی سے کہا۔

شیریں جو اسی طرح دور دراز نظر سے دور ہونے والی دور رہنے والی نظر سے امجد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اپنی ماں کی طرف پلٹی۔ "ممی آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

"تھوڑی دیر کے لئے چلی بھی جاؤ۔" مسز نیاز بھائی نے کہا۔

"ممی" کہہ کے شیریں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی ماں کو منع کیا۔ اور ایک ٹھنڈی گہری سانس لی۔

ہم حیدر آبادیوں کے ساتھ باہر جانے میں بدنامی نہیں ہو سکتی۔" امجد نے کہا۔

"نہیں ہو سکتی؟ کیا کہنا۔" شیریں اپنی کرسی پر سے اچھل ہی پڑی۔ "نذیر تم کو معلوم ہے۔ یہاں کیا مشہور ہوا تھا یہ کہ اصغر سے میری شادی ہو گئی ہے۔"

"شیریں"۔ نذیر نے پتلون کی کریز دونوں گھٹنوں پر ٹھیک کرتے ہوئے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ اصغر کا انتقال ہو گیا"۔

"نہیں"۔ شیریں کے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔ امجد نے فوراً تجزیہ کیا۔ اس چیخ میں تاسف نہیں حیرت ہی حیرت تھی۔ "کب؟"

"کوئی مہینہ بھر ہوا"۔ نذیر نے کہا۔

"ارے رے مجھے بڑا افسوس ہوا"۔ شیریں نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں جوانی کا رس اور جوانی کی چمک تو تھی۔ مگر ایک ایسی بے کیفی تھی گویا آنکھیں جذبۂ افسوس اور احساسات سے ہمیشہ کے لئے بیگانہ ہو چکی ہیں۔

مسز نیاز بھائی نے افسوس کا اظہار کر کے پوچھا۔ اور نذیر اصغر مرحوم کی موت کے حالات بیان کرنے لگا۔

اور امجد سوچنے لگا۔ اگر اصغر کی شادی اس لڑکی شیریں سے ہو جاتی تو اسے اس طرح عین جوانی میں موت نہ آ جاتی۔ بیچارا اصغر" خدا مغفرت کرے"۔ مگر وہ پیدا ہی اس لئے ہوا تھا کہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی تباہ کرے۔ عنفوانِ شباب میں اس نے گھوڑوں کی سواری کے ساتھ ساتھ ناچنا اور شراب پینا سیکھا۔ لڑکیوں کی موجودگی میں اس کی زبان کھل جاتی اور وہ گھنٹوں عاشقی کی باتیں کر سکتا۔ لیکن اپنے ساتھی افسروں کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وہ محض گالیاں دیتا رہتا۔ پہلے اس کے دانت

سفید سے زرد اور مٹیلے ہو گئے۔ حالانکہ اس کی عمر ابھی پینتیس سال ہی کی تھی۔ پھر اس نے گھوڑ دوڑ میں اپنی بساط سے زیادہ روپیہ خرچ کرنا شروع کیا۔ اور وہ دس ہزار کا غبن۔ خدا اس کی مغفرت کرے۔ خیر جائداد وغیرہ بیچ کے اس نے اپنی عزّت بچائی۔ کمیشن باقی رہ گیا۔ نوکری سے نہیں نکالا گیا۔ مگر پھر چھ مہینے کے بعد گیارہ بجے دن ہی سے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں، چڑھ جاتیں اور اس نے جنرل کلیمنٹ بنول کو گالی دے دی جو اس کی رجمنٹ کا مہمان تھا۔ اور وہ میجر سے پھر کپتان ہو گیا۔ بچارا، بچارا اصغر۔ اور جب اسکاچ وہسکی کے پیسے نہیں رہتے تو وہ جم خانہ وہسکی پر اتر آیا۔ پھر بھڑے پڑ اور عورتوں کی حد تک بھی یہی حشر ہوا۔ اس انگریز کرنل کی بیوی سے۔ کیا عورت تھی۔ کیا جسم، کیا حسن تھا۔ لیکن اس کے پیچھے اصغر نے سب کچھ لٹا دیا۔ دادا کا گھر بیچا۔ اپنی موٹر بیچ دی۔ یہاں تک کہ اپنا فرنیچر...... پھر چھایا دیوی۔ اس نے بھی اصغر کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ چھایا دیوی کا بھی کیا جسم تھا۔ سڈول، گداز، ایک زمانے میں سینما ایکٹرسوں کی سرتاج تھی۔ اب یہ حالت ہے کہ ریس کورس پر آتی ہے تو کوئی پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں، جوانی ڈھل چکی ہے، مگر اب بھی...... خیر اس نے بھی بچارے اصغر کو تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ غلطی بھی اصغر کی تھی۔ اور اسی چھایا دیوی کی وجہ سے تو شیریں اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

اور امجد سوچتا رہا کہ اصغر کی شادی اگر شیریں کے ساتھ ہوتی تو نہ اصغر اس طرح تباہ ہوتا، اتنی جلدی مرجاتا نہ شیریں زرِ خرید لونڈی کی طرح راج رتن بھائی کے

دمکتے ہوئے ہیروں کی عوض بک جاتی۔ رشید اور نذیر دونوں کا بیان تھا کہ شیریں کی نسبت اصغر کے ساتھ ہوگئی تھی۔ اور وہ اصغر کو پسند کرتی تھی۔ لیکن ایک دن رٹز ہوٹل میں جب وہ اصغر سے ملنے آئی تو اس نے اصغر کو چھایا دیوی کی گردن میں باہیں ڈالے دیکھا۔ اور وہ اسی طرح دروازے سے باہر نکل گئی۔ اور اس کے بعد اس نے کبھی اصغر سے بات نہ کی۔ اصغر بھی گالیاں دے دے کے خاموش ہوگیا۔

یہاں تک کہ دن رات کی شراب خوری اور سرمستی اور بے ادبی اور حماقتوں کی وجہ سے بہت سی رعایتوں کے بعد کورٹ مارشل نے بالآخر اصغر کو فوج سے برخواست کر دیا۔ انگریز کرنل کی بیوی کو تو بہت دور بھیجا ہی جا چکا تھا، چھایا دیوی...... دوسرے شکار کھیل رہی تھی، اور بہر حال اس کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا۔ کہ وہ اصغر کی پرورش کرتی اور اس کے بعد زندگی کے بقیہ ایک دو سال اصغر نے دیسی ٹھرا پی پی کے دھڑینوں کے ساتھ گذارے۔ ایک رات دفعتاً اس کے دل میں درد اٹھا۔ دھیڑنیاں گھبرا گئیں۔ مگر کوئی ڈاکٹر نہ آسکا۔ رات تاریک تھی۔ تاریکی بڑھنے لگی۔ خدا مغفرت کرے مگر اصغر پیدا ہی اس لئے ہوا تھا۔ کہ اپنی زندگی اپنے ہاتھوں تباہ کرے۔ اور شیریں نے اس روز بڑی غلطی کی تھی جو چھایا دیوی کے ساتھ اسے دیکھ کر اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی پھر اس کے بعد کسی اور فیشن ایبل اور اچھے طبقے کے نوجوان نے اس سے شادی کرنے کی خواہش نہیں ظاہر کی۔ اور بچارا اصغر اندھیری بڑی ہی تاریک رات کو جب اس کا دم نکلا تو دھیڑنیاں رونے لگیں اور کسی نے اس کا منہ قبلے کی طرف نہیں کیا......

شیریں نے اصغر کی موت کا ذکر کچھ نذیر اور کچھ امجد کی زبانی اس طرح سنا گویا اسے اس شخص سے کبھی دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا۔ وقت گذر چکا تھا۔ لیکن بات بھی نہیں رہی تھی۔

پھر جنید کا ذکر آیا۔

پھر نذیر نے بھنڈی بازار میں چراغاں اور باب پاکستان کا ذکر کیا۔ لیکن شیریں اور اس کی والدہ دونوں کانگریس کی طرف دار تھیں۔ شیریں نے تو یہ بھی ارادہ ظاہر کیا کہ وہ عنقریب 'وی آئی' کو چھوڑ کر کانگرس کی والنٹیر بننے والی ہے۔

امجد نے ہنس کے کہا۔ "کھادی کی ساڑی آپ پر بہت خوبصورت معلوم ہو گی۔"

پھر ولنگڈن یا ہاربر بار کے ساتھ چلنے کا اصرار شروع ہؤا۔ اب نو بج رہے تھے۔ شیریں نے پھر صوفے کے دونوں بازوؤں پر دونوں ہاتھ پھیلا کے سانپ کے پھنوں کی طرح انکار میں پنجے ہلائے۔ مگر آخر کار اپنی ماں کے اصرار سے چلنے پر ڈر کے نیم راضی ہوئی۔

امجد سوچ رہا تھا وہ کونسی طاقت تھی جس نے اس کی آزادی سلب کر لی تھی۔ قدامت ہرگز نہیں۔ محبت؟ غالباً نہیں۔ پھر کیا۔ سکے، ہیرے، نیلم، انگوٹھیاں، بروچ، کان کے آویزے۔ شاید۔ شاید۔

لیکن وہ چلنے کو نیم راضی ہوئی تو گھڑی دیکھ کر نذیر نے کہا۔ "نو بج رہے ہیں۔"

اب اس حماقت کی کیا ضرورت تھی؟ نو بج رہے تھے نو بجا کریں۔ شیریں جو کپڑے بدلنے کے لئے اٹھی تھی۔ پھر بیٹھ گئی۔ "اب بہت دیر ہوگئی ہے۔" نذیر بھی خاموش ہو گیا۔ اور شیریں کی ماں نے بہت اصرار سے نذیر اور امجد کو آئندہ اتوار چائے کی دعوت دی۔

اس کے گھر سے واپس ہوتے ہوئے امجد نے نذیر سے پوچھا۔ "پہلے تو آپ لوگوں کے ساتھ یہ خوب اِدھر اُدھر آتی جاتی تھی نا!"

"ہاں بہت۔ ریس کورس، تاج، ولنگڈن، ایک مرتبہ ہیں، اصغر، یہ شیریں اور آمنہ پونا بھی گئے تھے۔ ویک اینڈ گذارنے۔ مگر اب وہ نہیں آئے گی۔ امجد۔ میں نے کہہ دیا تھا نا؟"

"کوئی بات ضرور ہے۔"

"میرے خیال میں تو وہ راج رتن بھائی جوہری کا قصّہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اسے رکھ لیا ہے۔ اور اِدھر اُدھر کہیں آنے جانے نہیں دیتا۔"

"افسوس ہے ایسی خوبصورت لڑکی اور پھر شریف خاندان کی۔ ویک آئی میں افسر بھی ہے اور وہ اس طرح ایک جوہری کی داشتہ بن کر رہ رہی ہے۔"

باب محمود غزنوی پر بجلی کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ اور چائے کی دوکانوں اور ہوٹلوں سے سستے فلمی گانے کی صدائیں آ رہی تھیں۔

"ہاں افسوس کی بات تو ضرور ہے۔" نذیر نے اسٹیرنگ وھیل کو گھما کے سامنے سے آتی ہوئی بس سے اپنی گاڑی بچا کے کہا۔ "اور امجد مجھے حیرت تو یہ ہے۔ کہ

پہلے یہ ایسی نہیں تھی۔"

"احتیاط سے رہتی تھی!"

"بڑی احتیاط سے۔ اب دیکھو نا میں اتنے سال سے جانتا ہوں۔ بے تکلفی ہے اس زمانے میں بڑی مشکل سے کبھی ایک آدھ اچٹتا ہوا بوسہ بھی دیا تو بہت۔ ورنہ بس اخلاق برتتی تھی۔ لیکن بڑی شرافت سے رہتی تھی۔ اصغر مرحوم تو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔"

"اپنے ہاتھوں اس نے اپنی جان لی۔"

"جب تم اصغر کا ذکر کر رہے تھے تو میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر شیریں کی شادی اس سے ہو جاتی تو دونوں کی زندگی سُدھر جاتی۔"

"ہاں۔ شاید۔"

ہارن بی روڈ پر روشنیاں کم ہو رہی تھیں۔

نذیر نے کہا۔ "اس کا باپ انشورنس کا ایجنٹ ہے۔ ایسی کیا آمدنی ہوتی ہوگی۔"

"یہ تو شاید اس کا سوتیلا باپ ہے نا؟"

"ہاں سوتیلا۔ مجھے یقین ہے جب ہم تم اس کے یہاں ڈرائنگ روم میں باتیں کر رہے تھے تو وہ پردہ کے پیچھے بیٹھا ہوگا۔"

"یہ راج رتن بھائی کے ہاتھ پھنسی کیسے؟" امجد نے کہا۔

"معلوم نہیں امجد کہاں کھانا کھائیں گے؟ ارجن ٹی نا چلتے ہو؟"

"چلو۔"

"ممکن ہے اسے راج رتن بھائی سے محبّت ہو؟" امجد نے کہا۔

"ممکن ہے۔"

"لیکن میرے خیال میں تو یہ محض جواہرات کی چمک ہے۔ اکثر شریف لڑکیاں جواہرات اور بنارسی ساڑیوں کی وجہ سے جوہریوں اور بنیوں کے ہاتھ گروہ ہو جاتی ہیں۔"

"ممکن ہے" اور اس نے ارجن ٹی نا کے سامنے گاڑی روکی۔ "دیکھا امجد۔ مہرو کیسی جھوٹی ہے۔ کہہ رہی تھی بہار اچکمار راج بھوج کے یہاں کاک ٹیل ڈانس میں جارہی ہوں۔ مگر اس کی گاڑی یہاں کھڑی ہے۔"

اتوار کے دن صبح کو لکھ پتی سیٹھ ہارون یعقوب جو بیجاپور کی طرف فولاد کی مصنوعات کا ایک کارخانہ کھول چکے تھے۔ اور امجد کے فولاد کے سامان کے کارخانے میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ناشتہ کر کے آئے تھے۔ اس لئے صرف پھل کھائے اور چائے پی۔ ایک چیکو چھیلتے چھیلتے شیریں نیاز بھائی کا ذکر سن کر کہنے لگے۔ " اکثر بمبئی میں دیسی گرل نہیں ہے۔ اجون تو جرا خراب ہو گئی ہے۔ پہلے بہت خبصورت تھی۔ دیری دیری بیوٹی فل۔ مگر وہ بالکل بیکار ہے۔ وہ جیل میں ہے نا

جی۔ یہاں تو یہ مشہور ہے کہ راج رتن بھائی اس کو رکھیلا ہے۔"

"اچھا تو یہ سچ ہے؟" امجد نے پوچھا۔

"یہ کیسا معلوم پڑسی گا۔" سیٹھ ہارون یعقوب نے کہا۔ "پن ہم ایسا سنے لا ہے راج رتن بھائی جو یلر اس کو قفل کنجی میں رکھے لا ہے۔" پھر بڑی ہی فصیح انگریزی میں سیٹھ ہارون یعقوب نے بتایا کہ جب سے وہ راج رتن بھائی کی معشوقہ بنی ہے۔ وہ اس کو کہیں آنے جانے نہیں دیتا۔

"شاید اس کو بھی راج رتن سے عشق ہوگا۔" امجد نے کہا۔

"ہاں ممکن ہے۔" چائے میں دودھ ڈالتے ہوئے میجر نذیر نے کہا۔

"میں نے سنا ہے راج رتن بھائی اچھا خاصا ہینڈسم آدمی ہے۔" میجر رشید نے اپنا سرویٹ تہہ کر کے میز پہ رکھتے ہوئے کہا۔

"ادھر دیکھو میں ایک بات بولتا ہوں نا۔" سیٹھ صاحب نے اس رائے سے قطعی طور پر اتفاق یا اختلاف کئے بغیر کہا۔ "ہم بھی بہت سا چھوکری لوگ رکھا۔ اکھا بمبئی کو معلوم ہے۔ مگر یہ عشق وشق ہمارا سمجھ میں نہیں آیا۔ اجی کپڑا دیتا ہے۔ کیا؟ بنارسی ساڑی، ریشم، جارجٹ، زیور دیتا ہے۔ کیا؟ ہیرا جواہر، ایرنگ، بروچ، نیک لیس، بریسلٹ اور جو لڑکی جرا خبصورت ہے تو تھوڑے دن سواری کو موٹر دینا مانگتا۔ اچھا فلیٹ میں رکھنا مانگتا۔ بس راج رتن بھی ایسا کرے لا ہے۔ نہیں تو اکھی بمبئی میں ایک سے ایک خبصورت جوان ہے۔ شیریں ہمارے میجر نذیر پہ کیوں

نہیں مرے لا ہے۔ میجر نذیر تو راج رتن بھائی سے زیادہ خبصورت ہے۔"

"میں آداب بجالاتا ہوں"۔ میجر نذیر نے کہا۔

"ہم جھوٹ نہیں بولتا۔ سچی بات بولنے منگتا"۔

"لیکن وہ کسی اچھے لڑکے سے شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ اس طرح کسی کی رنڈی بن کر رہنے میں وہ عزت تو محسوس نہیں کرتی ہوگی"۔ امجد نے کہا۔

انگریزی میں فلسفیانہ انداز سے سیٹھ ہارون یعقوب نے جواب دیا۔ "اب وہ بدنام ہو چکی ہے۔ اس سے شادی کون کرے گا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔"

"بے شک"۔ میجر رشید نے سر ہلایا۔ اور خلالوں کا ڈبہ میجر نذیر کی طرف سرکا دیا۔

سیٹھ ہارون یعقوب نے اردو میں پھر تشریح شروع کی۔ "ہم آپ سے بولے اس کا باپ چھوٹا انشورنس ایجنٹ۔ صبح سے شام تک چکر کرے لا ہے۔ پھرے لا ہے مرے لا ہے۔ تو چار پیسے کمائے لا ہے۔ اور لڑکی ویک آئی میں فیشن ایبل بنے لی ہے۔ اجون ریس کورس، تاج محل، ولنگڈن کلب، جوہو میں خرچا کرنے کو پیسا کدھر سے آئیں گا۔ میرا تو ایسا دل بولتا کہ یہ اس کا سوتیلا باپ ہے نا۔ یہ ریخ، یہ اس کو بھڑائے لا ہے۔ دیّوس۔"

میجر رشید معافی چاہ کے اٹھے اور سیٹھ ہارون یعقوب نے امجد حسین سے مخاطب ہو کے انگریزی میں کہا۔ "آپ کے یہاں گوداوری سکیم میں اگر......"

اسی اتوار کو چار بجے جب امجد اور میجر نذیر شیریں نیاز بھائی کے مکان پر پہنچے۔ تو دروازہ شیریں ہی نے کھولا۔ وہ گلابی رنگ کا غرارے دار لمبی پائنچے دار پاجامہ اور اسی رنگ کی قمیص اور اسی رنگ کی اوڑھنی اوڑھے تھی۔ اس سال بمبئی ریس کورس پر غرارے دار پاجامے بہت مقبول ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے نرگس کو جدن بائی یہی غرارے دار پاجامے پہنا کے لائی۔ نرگس تو کھلے میدان میں غرارے دار پاجامے اور بلند قد اور پہلوان جیسے جسم کی نمائش کرتی پھرتی۔ کالج جانے والی شریف لڑکیاں اور وہ لڑکیاں جو ہندوستانی فلم اکثر دیکھ لیتی ہیں۔ اس کی طرف رشک سے دیکھ لیتیں۔ مگر جنگ سے پہلے ہر سال ولایت' اور دورانِ جنگ میں ہر سال کشمیر جانے والی لکھ پتیوں کی لڑکیاں ذرا معصوم سی حقارت اور بُعد سے تمام سینما ایکٹرسوں کی طرف دیکھتی ہوئی، اپنے اپنے باکسوں میں جا بیٹھتیں۔ جدن بائی اپنی لڑکی کے حسن اور اس کی مقبولیت سے بالکل مطمئن، ایک بنچ پر بیٹھی رہتیں۔ جہاں سے گھوڑ دوڑ کا آخری حصّہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اور ان کے قریب بیلی مہارانی کتھا گڑھ پاندان کھولے ہندوستان بھر کے والیانِ ریاست کو بیٹھی دعائیں دیتی رہتیں۔ اور مہارانی صاحبہ کے والد ماجد حنائی ریش، انگرکھے اور دوپلی ٹوپی، میں ہر اس شخص کو جو ان کی غیر معمولی شخصیت سے واقف نہیں تھا۔ استاد جی معلوم ہوتے نرگس کو دیکھ دیکھ کر اور کچھ اور نا کتخدا لڑکیوں کو، جن کا تعلق غالباً یو۔ پی اور پنجاب سے تھا یہ ہمت پڑی کہ اگلے ہفتے ریس میں غرارے دار پاجامے پہن کے آئیں۔ پھر کچھ بوہرہ لڑکیاں اس لباس میں آئیں اور پھر یہ لباس چل نکلا۔ یہاں

تک کہ ویرا نے، جو اسی سال "شکاری" میں نام پیدا کر کے مشہور ہو چلی تھی اور جس سے محسن عبداللہ ذرا اچھے سے لینن کی وہی بش شرٹ پہنے بینا کا غم غلط کر رہے تھے۔ ویرا نے لباس شب خوابی پر دوپٹہ اوڑھ کر ریس کورس کو زینت بخشی۔ افسوس کہ یہ لباس چل نہ سکا۔

شیریں نے نذیر سے ہاتھ ملایا لیکن امجد کو محض ایک شفقت آمیز تبسم سے اجنبیوں کی طرح خوش آمدید کہا۔ جس سے وہ جل بھن کر رہ گیا ہوگا۔ مگر کسی کے دل اور اخلاق پر کسی اور کو کیا اختیار۔ شیریں کی ماں نے البتہ ہاتھ ملایا۔

دفعتاً سامنے کے کمرے کے دروازہ کا پردہ سرکا۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی برآمد ہوا۔ جو یقیناً بی جی کا شیخ تھا۔ لڑکی کا سوتیلا باپ۔ اور امجد کو معاً خیال آیا کہ نذیر کا کہنا ٹھیک تھا۔ اس سے پہلے جب ہم دونوں یہاں تھے تو وہ یقیناً اس پردے کے پیچھے بیٹھا ہوگا۔"

شیریں نے دونوں سے اس کا تعارف انگریزی میں یہ کہہ کر کرایا۔ "یہ ڈیڈی ہے" "ڈیڈی" کی موجودگی میں نذیر نے شیریں کیساتھ وہ بے تکلفی نہیں برتی۔ نہ اس کا ہاتھ کئی کئی منٹ کے لئے اپنے ہاتھ میں لیا۔ نہ اس کی طرف محبت سے آنکھیں چمکا کے دیکھا۔ نہ چھیڑ کے لئے اس کے کسی چاہنے والے کا ذکر کیا۔

جوں جوں کیک، پکوڑیاں، سموسے، بھنے ہوئے پستے، سیویاں، اور پھر کیک کی گردش ہوتی گئی گفتگو سنجیدہ سے سنجیدہ تر ہوتی گئی۔ زیادہ تر سیاسیات۔ "پہلے

انگریزوں کو نکالو۔ ہندو مسلمان راجاؤں، مہاراجوں، سیٹھوں، ساہوکاروں کی عزت ہم پر فرض ہے۔ لیکن انگریزوں کی نہیں۔ مسٹر پی جی شیخ نے دہرایا۔

"لیکن انگریزوں کی نہیں۔" امجد کی طرف پیسٹری کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے مسز نیاز بھائی نے کہا۔ عجیب بات تھی اپنے دوسرے اور زندہ شوہر کے نام پر شیریں کی والدہ مسز شیخ نہیں کہلاتی تھیں۔ مگر اپنے مرحوم شوہر یعنی شیریں کے والد کے نام پر ابھی تک مسز نیاز بھائی مشہور تھیں۔ یہ غالباً زر یا شاید حسن کے زور کا اثر تھا۔ لڑکی کی حیثیت اس خاندان میں مرکزی تھی۔

میجر نذیر نے اس سیاسی مسئلے پر کوئی رائے دینی مناسب نہ سمجھی۔ اس نے دیکھا کہ شانے کے قریب مسٹر پی جی شیخ کے سوٹ کو کیڑوں نے کاٹ کے ایک چھوٹا سا چھید بنا دیا ہے۔ اور استری کا کپڑا جو نظر آرہا ہے بہت بوسیدہ ہے۔ اس کا سوٹ کم سے کم دس سال پرانا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچ کر میجر نذیر نے اپنے پوپ اینڈ بریڈلے کے سئے ہوئے پتلون کی کریز ٹھیک کی۔ اور مسٹر شیخ اور ان کی بیوی کی سیاسی رائے کا جواب محض ایک بااخلاق ہنسی سے دیا۔ "ہی ہی ہی"

امجد، فولاد کے کارخانے کا مالک، "ہگار" اشتراکیت بگھارنے لگا۔ شیخ صاحب ہیں انگریزوں سے نسلی تعصب کا قائل نہیں۔ دیکھئے نا۔ اگر انگریز مہاجن کی جگہ ہندوستانی مہاجن لے لے۔ تب بھی وہی بات ہوگی۔ غریب ہندوستانی نئے مہاجن کا غلام بن جائے گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی مہاجن کے راج میں آپ کو محنت کے

معاوضے میں پیٹ بھر کھانا ملے گا۔" اور پھر ہمت کر کے شیخ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے امجد نے بیدردی سے وار کیا۔ "کیا ہندوستانی مہاجن کے راج میں آپ کی لڑکیوں کی عصمت اور عزت محفوظ رہے گی؟"

مسٹر بی جی شیخ کسی مجرم مریض کی طرح تلملا گئے۔

امجد نے آخر میں کہا۔ "اصلی راج مزدور کا راج ہے۔"

میجر نذیر پتلون کی کریز درست کر کے پھر ہنسے۔ "ہی۔ ہی۔ ہی۔ مسٹر نیاز بھائی میرے دوست امجد حسین بڑے پکے اشتراکی ہیں۔ یہ لندن سکول آف اکنامکس میں پڑھنے کا اثر ہے۔ وہاں ایک بڑا مشہور پروفیسر ہے۔ کیا نام ہے اس کا امجد لاسکی؟ — لاسکی؟ لاسکی، لاسکی تو شاید حیدرآباد میں ہم لوگ ریڈیو کو کہتے ہیں۔ یہ لاسکی کا اثر ہے۔ ممکن ہے، ایک دن امجد اپنی فیکٹری مزدوروں کے نام منتقل کر دیں۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔ مگر یہ تو ذرا مشکل ہے ..... بھئینک یو شیریں مجھے تلے ہوئے مٹر بہت پسند ہیں۔"

چلتے وقت مسٹر بی جی شیخ نے حیدرآباد کے تقریباً ایک درجن امراء اور اسی قدر اعلیٰ عہدہ داروں سے اپنی قریبی رشتہ داری یا دلی دوستی اور بے تکلفی کا تذکرہ کیا، اور اس کے بعد میجر نذیر سے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی مذکورۂ بالا امرا اور عہدہ داروں کے حلقہ میں شامل ہونے کے باعث اخلاقی طور پر مجبور ہیں کہ بیمہ اور انشورنس کے کاروبار میں مسٹر شیخ کی مدد کریں۔

جس کا میجر نذیر اور امجد دونوں نے پختہ وعدہ کیا۔

اگلے ہفتے۔ گھوڑ دوڑ میں نذیر اور امجد پرانے پاپیوں سے "ٹِپ" پوچھتے پھر رہے تھے۔ ممبروں کے احاطے میں باکسوں کے اس سائبان کی طرف جہاں گھوڑے پھرا کے دکھائے جاتے ہیں۔ بمبئی کا پورا فیشن ایبل طبقہ، عورتیں اور مرد چکر لگا رہے تھے۔ بیٹھے ہوئے تھے۔ کھڑے ہوئے کسی بورڈ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یا اپنے جیتے ہوئے ٹکٹوں کے روپے لینے قطار در قطار کھڑے تھے۔ جہاں ہزاروں کے وارے نیارے ہو رہے تھے۔ وہاں دو تین سیٹھ بھی تھے۔ اپنے مارواڑی ٹھاٹھ میں۔ زری کی ٹوپی اور ململ کی دھوتی۔ گیبرڈین کا کوٹ اور سفید پتلون پہنے دھوپ کی عینک لگائے۔ ایک نوجوان نے اپنی ساتھی نوجوان عورت سے کہا۔ "بلیک پرنس ون۔ چکرورتی پیلس ٹو" اس کے ساتھ جو نوجوان عورت تھی .... اس کے بال سیاہ تھے۔ بلاؤز گہرا سرخ تھا۔ ہونٹوں کی لپ سٹک کی سرخی اس سے ذرا مدھم تھی۔ اور ساڑی ہلکی کریم سبز رنگ کی تھی۔ تین لڑکیاں۔ تینوں سر ایوب خاں کے خاندان کی۔ کالے کالے لباس، گورے گورے رنگ، ماژندرانی خدوخال سامنے سے گذر گئیں۔ ایک لڑکی زرد رنگ کی، بنارسی ساڑی پہنے، شانوں پر کالے کٹے ہوئے بال بکھرائے۔ پژمردہ اور تھکی ہوئی سی دو سنجیدہ لیکن خوش خوش، خوش خوش، شلوار پوش لڑکیوں سے آہستہ آہستہ میٹھی باتیں کر رہی تھی اور اس کے سر پر درخت کی گھنی چھاؤں تھی۔ سامنے سے لوگ فیلٹ ٹوپیاں پہنے، عورتیں رنگا رنگ کی ساڑیاں پہنے، تیتریاں، ہزاروں کی تعداد میں آ اور جا رہے تھے۔ ایک خوبصورت سی انگریز عورت گذری جس کا فراک ساری کی نقل تھا۔ سیاہ

بلاؤز اور لال جھالر۔ ایک لڑکی گجراتی میں ہنستی ہوئی باتیں کرتی آ رہی تھی۔ "اگر میں اسی طرح ہارتی رہی...... آہا آشا" اور آشا ٹھٹک کے کھڑی ہو گئی۔ چاکلیٹ کی زمین پر ریشم کے بڑے بڑے کنول کے پھول، چہرے پر میکس فیکٹر اور آنکھوں پہ دھوپ کی چوڑی سی عینک اور اس کا نصف انچ موٹا فریم۔ "میر دلا...... چکوری...... سنی سائڈ......" "میں تو عرب ڈاربی کے دن ضرور آؤں گی۔"

ہر ہائی نس بیگم آغا خان۔ نئی بیگم آغا خان خراماں ٹہل رہی تھی۔ بلند قامت، باوقار۔ ہلکی نارنجی رنگ کی ساری پہنے۔ ان کے ساتھ ایک اور خاتون اور ایک سکریٹری، اے، ڈی، سی دونوں ہمرکاب۔ بیگم آغا خان۔ سراپا تمکنت، وقار، تبسم

"باجپائے۔ باجپائے......" نذیر نے پکار کے کہا۔

راجہ باجپائے نے گھوم کے دیکھا۔ "نذیر؟...... ابھی آیا...... ابھی ذرا بکی سے ٹپ لے کے۔ تم تو زیادہ نہیں کھیلتے نا۔ یہ دیکھو نمبر ۷۔ برنر ڈشا اچھا گھوڑا...... ابھی نہیں آؤٹ سائڈر ہے۔ تو اس سے کیا۔ مجھے اس کے ٹرینر نے کہا مہاراجہ کشمکش اسے اسی لاکھ میں خریدنا چاہتے ہیں۔ ون نہیں تو پلیس تو یقینی ہے...... اچھا ابھی آیا۔"

کھانس کے راجہ باجپائے نے زمین پر تھوکا۔ اور ادھر جہاں گھوڑے گھمائے جا رہے تھے۔ غائب ہو گئے۔ گذشتہ ریس کا کپ دیا جا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ رشید الظفر کپ دے رہی تھیں۔ نذیر تو ادھر دیکھ رہا تھا۔ امجد جھنگے سے اتر آیا۔ اور فیشن ایبل مجمع کو دیکھتا ہوا پھر آوارہ گردوں کی طرح پھرنے لگا۔ وہ موٹی سی ذرا گرم سی انگریز عورت جس نے اس

سکھ سے شادی کی تھی۔ کمبخت بلا ناغہ ہر میٹنگ میں آتی ہے۔ اس کے موٹے تازے چہرے مصنوعی جھبر کے رنگ کے بالوں اور سنہری ساڑی پر نظر پڑنا ضروری ہے۔ آج سنہری کمخواب......." اور یہ حشرات الارض ان کو معلوم نہیں ممبروں کے احاطے کے ٹکٹ کیسے مل جاتے ہیں۔ نو دولتے۔ یا سٹہ کھیلتے ہیں یا فلم کمپنیوں سے خرید کر تھیٹروں کو بیچتے ہیں۔ کمبختوں کو کوئی اچھے گھرانے کی لڑکی نہیں ملتی۔ تو ان ایکسٹرا لڑکیوں کو، رنڈیوں کو اٹھا لاتے ہیں۔ جوتے کے ایک بڑے متمول سوداگر نے یہ الفاظ اپنے ساتھی سے کہے اور امجد نے اس گروہ کی طرف دیکھا جس کے متعلق یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ لڑکی جو سامنے تھی اس کے لبوں پر سستی، گہری سرخی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ اور راتوں کے جاگنے سے پلکیں بوجھل تھیں۔ مگر یوں بری نہ تھی۔

گھنٹی بجی اور ریس شروع ہوئی۔ راجہ باجپائے کی پیشین گوئی غلط نکلی۔ برنڈشا ہارا اور بلیک پرنس جیتا۔ فیوریٹ کے جیتنے سے ملتا ہی کیا ہے۔ بس ایک دو روپے اور کیا۔ اور جب وہ قطار میں اپنی جیت کے پیسے لینے کھڑا تھا تو اس نے اپنے سیدھے جانب دوسری قطار میں پھر رشید کو شیام نرائن سے باتیں کرتے دیکھا۔

"شیام نرائن یہاں بھی موجود" امجد نے اپنے دل میں کہا۔ "مگر یہ خبیث رشید اس سے میرا تعارف نہیں کرائے گا۔"

شیام نرائن کا رنگ ذرا سانولا اور قد بلند تھا۔ لیکن اس کی تینوں لڑکیاں سرخ و سفید، میانہ قد اور بڑی حسین تھیں۔ امجد شیام سے منصوری میں ملا تھا۔ مگر کچھ ایسی تلخ

سیاسی بحث ہوئی تھی کہ رشید نے اسے ایک بہانہ بنا لیا اور شیام نرائن کی لڑکیوں سے کبھی امجد کا تعارف نہیں کرایا۔

ایک مرہٹہ لڑکی فیروزی رنگ کی ساری پہنے، اپنے پیسے لے کے واپس لوٹی۔ رشید بدستور شیام نرائن سے باتیں کر رہا تھا۔ اور بار بار امجد کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس کے بعد جو ریس ہوئی اس میں سامنے کے سبزے پہ کھڑے کھڑے نذیر نے پلٹ کے جو دیکھا تو بنچوں والے سائبان کے نیچے کی نشستوں میں ایک ذرا بدصورت سی پارسی لڑکی تنہا بیٹھی تھی۔

"شیریں" نذیر اس کا نام لے کے اس کے پاس جا بیٹھا۔

امجد نے پلٹ کے دیکھا۔ یہ شیریں نیاز بھائی نہیں تھی۔ بلکہ وہ پارسی شیریں تھی جس سے وہ پہلے مل چکا تھا۔

وہ بھی پارسی شیریں کے دوسرے جانب کرسی پہ بیٹھ گے باتیں کرنے لگا۔ سب ویول ہی پہ کھیلنا چاہ رہے تھے۔ "اتنا ہاٹ فیورٹ ہے۔ کیا دے گا۔ ایونز تو ہو ہی چکا ہے"۔

لیکن چونکہ ویول ہی محفوظ تھا۔ امجد نے ویول کے لئے دس روپے نذیر کے حوالے کئے۔ نذیر خود بھی ویول ہی پہ ٹکٹ لینے کے ارادے سے اٹھا۔ اور امجد اگرچہ کہ پارسی شیریں سے باتیں کر رہا تھا۔ لیکن اس کی نظریں پھر رشید پہ لگی ہوئی تھیں۔ جو شیام نرائن کی تینوں حسین لڑکیوں سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا۔

پھر معلوم نہیں رشید کو کیا شرارت سوجھی۔ وہ امجد اور شیریں کے پاس پہنچا۔ اور امجد سے کہا شیام نرائن جی تمہیں بلا رہے ہیں۔ چلو۔ شیام نرائن جی اور ان کی لڑکیاں تو معلوم نہیں کہاں غائب ہو گئے تھے۔ لیکن رشید نے امجد کو لے جا کے مہارانی صاحبہ کنتھا گڑھ کے والد ماجد کے پاس لا بٹھایا، جو اپنی حنائی ڈاڑھی میں کنگھی کر رہے تھے۔ اور آلتی پالتی مارے بنچ پر بیٹھے کبھی اپنی صاحبزادی اور کبھی جدن بائی سے اپنی سب سے چھوٹی پوتی کے حسن کی تعریف کر رہے تھے۔ امجد کو انہوں نے بڑے تپاک سے بٹھا لیا۔ اور پھر رشید کہیں غائب ہو گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد امجد، مہارانی صاحبہ کنتھا گڑھ کے والدِ ماجد کی سرپرستانہ اور مشفقانہ گفتگو سے پیچھا چھڑا کے بھاگا۔

ایک سانولی سی لیکن بڑی ملیح صورت، چھریرے بدن کی عورت انوکھے ڈیزائن کی بڑی ہی خوبصورت ساڑی پہنے کسی طرف سے آ کے راستے کے قریب کھڑی ہو گئی۔ تین اسٹاف آفسر جھک کر آداب بجا لائے۔ تین اے ڈی سی تعظیماً سر جھکا کے ذرا ذرا فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ اس نے کسی سٹاف آفسر سے کچھ پوچھا اس نے جواب دیا ۔۔۔ "نہیں یور ہائی نس"۔ پارسی امیر زادیوں نے بے تعلق ہو کر یہ منظر دیکھا۔ اور بے پروا وِن کے ٹکٹوں کی کھڑکیوں کی طرف چلی گئیں۔ پھر وہ ملیح خوبصورت مہارانی سیڑھیوں کی طرف گئی۔ نذیر نے امجد کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ جانتے ہو کون ہے؟"

"نہیں"

"مہارانی پیپل نگر - چھوٹی مہارانی۔"

"اچھا - وہی جو بیشواز پور کے راجہ کی بیٹی تھی -

"جس کی شادی امرت نگر کے تیسرے راجکمار بھرت چندر سے ہوئی - پھر اس سے طلاق لے کے یہ مسلمان ہوگئی - اور اس نے ہمارے تمہارے دوست سیٹھ یعقوب ہارون سے شادی کی"

"نہیں جی۔"

"سیٹھ یعقوب ہارون کو کیا سمجھتے ہو - کروڑ پتی تھا - رحیم بھائی کے ساتھ تباہ ہوا - اب بھی اس کے پاس دو تین کروڑ تو آسانی سے نکل ہی آئے گا - پھر جب جنگ شروع ہوئی تو یہ سیٹھ یعقوب ہارون کو اس رہی کلمیشن والے جھگڑے میں پھنسا کے نکل گئی اور ایک امریکن کپتان سے شادی کی اس کا نام میں بھولتا ہوں - پھر آخر اسے بھی چھوڑا - اور گذشتہ سال یہیں کورس پہ میں اس کا اور مہاراجہ پیپل نگر کا رومانس دیکھا کرتا تھا - اب بڑی مہارانی تک اس سے کانپتی ہے۔"

آگے "ڈون" کے کھمبے کے قریب رشید شیام نرائن جی اور ان کی تینوں لڑکیوں سے باتیں کر رہا تھا - امجد نے نذیر سے کہا - میں اس شیریں کے پاس بیٹھا تھا - جب یہ رشید مجھے اٹھا لایا - تم کسی ترکیب سے جا کے اس کو ان لوگوں کے پاس سے ہٹا لاؤ - نذیر نے جا کے رشید سے کہا - "بھئی بیگم پارہ تمہیں پوچھ رہی تھیں - تم ان سے ملے ہوتا۔"

رشید کہتا ہی رہا "میں نے ریس کورس تو کیا کبھی سینما میں بھی بیگم پارہ کی صورت نہیں

دیکھی۔ لیکن نذیر اسے زبردستی لے ہی آیا۔

گھوڑے جیتتے اور ہارتے رہے۔ انسان شرطیں لگاتے اور پچھتاتے رہے۔ عورتیں اپنی ساڑیوں اور میکس فیکٹر کی کریموں، پاؤڈروں اور لبوں پہ لگانے کی سرخیوں کی نمائش کرتی رہیں۔ اُدھر دیکھو اشوک کمار جودھ پوری کوٹ پہنے بیٹھا ہے اس کو جانتے ہو وہ کون ہے روز نتھال ہے۔ جوہری فرانسیسی یہودی۔ مہاراجہ کشمیر کا بڑا دوست ہے۔ انگریز سپاہی خاکی یونیفارم پہنے "ون" کے کھمبے کے قریب کٹہرے سے لگے کھڑے ہیں۔ اور وہ جو لڑکی ہے، وہ مشہور سینما ایکٹرس ہے، دیکھو اس کی پیٹھ ننگی ہے، اور کیسی تنگ چولی پہنے ہے۔ دو ملازمین ترکی ٹوپی، سفید کوٹ اور نیکر پہنے کھڑے ہیں۔ وہ احاطے کے اندر کیسے آگئے؟ وہ بیس سال کی دو عورتیں چلی جا رہی ہیں۔ رفتار اور اونچی ایڑی کی وجہ سے ان کی کمر لچک رہی ہے اور ہوا ان کی ہلکی جارجٹ کی ساڑیوں کے پلو اڑا رہی ہے۔ وہ دیکھو گندمی رنگ، چہرے پر داغ۔ شارک اسکن کا کوٹ، گلے میں دوربین۔ موتی لال ایکٹر کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ "بڑا مسخرا ہے۔ اس دن جب میں نے اسے ٹیلیفون کیا۔ اس نے میری آواز نہ پہچانی اور پوچھا کون ہے۔" میں نے کہا "فلموں میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔" کہنے لگا میں کیا کروں۔" میں نے کہا "مدد کیجئے۔ بڑی مشکل سے آپ کا ٹیلیفون نمبر ڈھونڈا ہے۔ موتی لال نام کے بمبئی میں جتنے آدمی ہیں۔ سب کو ٹیلیفون کر چکا ہوں۔ ورنہ آپ کا سراغ کیسے ملتا۔ کہنے لگا۔ غلط نمبر ملا ہے۔ میں موتی لال ایکٹر نہیں، موتی لال مسالے والا ہوں۔ کیا بھیجئے گا۔ ہینگ یا زعفران؟ اور یہ کہہ کے

ظالم نے ٹیلیفون کا ریسیور رکھ دیا۔" یہ کہہ کے دادطلب نظروں سے شیام نرائن جی نے رشید کی طرف دیکھا۔

چونکہ ان کی لڑکیاں اس مذاق پر خوش ہو کے ہنس رہی تھیں، رشید نے بھی ہنسنا ضروری سمجھا۔

گھوڑ دوڑ ہوتی رہی۔ ایک اینگلو انڈین گلے تک بند گیبرڈین کا سوٹ پہنے ہاتھ میں دُوربین لئے پھر رہا ہے۔ نہیں یار یہ اینگلو انڈین نہیں یہ تو ارباب ہے۔ فرنٹیر ارباب جی۔ یہ ایک پنجابی لڑکی کا تبصرہ تھا۔ جو اسی ارباب خاں سے باتیں کر رہی تھی۔ خود بھی ترنگی، بال ترشے ہوئے لیکن بالوں میں سینکڑوں پنیں۔ پرانی وضع کے کرن پھول، ناخنوں پر گہری سرخ پالش لگائے، سیاہ زمین کی ساڑی پر سفید سرخ، زرد پھول، اور اس کے ساتھ یہ غالباً اس کا شوہر اور ارباب سے ناواقف۔ اور ادھر یہ صاحب جو اپنی کتاب پر گھوڑوں کو دیکھ دیکھ کر نشانات لگا رہے ہیں۔

یہ جو سبز سرج کا سوٹ پہنے فیلٹ ہیٹ لگائے، مینڈک کی سی آنکھیں نکالے چلے آرہے ہیں۔ گنگنا نگر کے مہاراجکمار ہیں۔ ادھر دیکھو اس گجراتن کی جالی کی ساڑی تو دیکھو اور وہ دوسری۔ بھئی گجرات کے حسن کے ہم بڑے قائل ہیں۔ پنجاب اور گجرات۔ ورنہ دوسرے صوبوں میں اگر حسن ہے تو نمک نہیں یا نمک ہے تو بس نمک ہی نمک۔ دیکھو تیسری مہارانی پیپل نگر مہاراج کے پاس کس شان سے بیٹھی ہے۔ اُدھر مہاراج شیروناہیں ادھر وہ دیکھو یہ ایک میل کی ریس ہے۔ دے گے بانڈ گنگ۔ دے گے بانڈ گنگ

سلطانہ۔ سلطانہ۔ کم آن سلطانہ۔ کم آن جنجر بیر۔ کم آن وے گے بانڈ گنگ۔ کم آن کم آن سلطانہ۔ وے گے بانڈ گنگ۔ کم آن سلطانہ۔ سلطانہ اور پھر تالیاں ہی تالیاں

دروازے کے قریب زمین پر بے تکلفی سے تھوک کے راجہ باجپائے نے کہا۔

"نذیر یار مت پوچھ میں تین ہزار روپئے ہارا۔ دو ہزار تو صرف وے گے بانڈ گنگ پر ہارا۔ کیا گھوڑا مار کھا گیا۔ بس دو ہیڈ سے۔ خیر سویپ سٹک میں ضرور جیتے گا......

ہلو راج رتن...... راج رتن.... تم نذیر سے واقف ہو۔ میجر نذیر۔ راج رتن بھائی جویلر۔ نمستے بھابھی جی۔"

امجد نے جو نذیر کے ساتھ تھا، راج رتن بھائی کی طرف غور سے دیکھا۔ گورا رنگ لمبی سی ناک، آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت، سر کے بالوں میں کہیں کہیں سفید ڈورے اوپر کا دھڑ لمبا۔ نیچے کا مقابلتاً چھوٹا۔ ململ کی قمیص کے اندر بنیان، ململ کی دھوتی، سر پہ گاندھی ٹوپی۔

اور ان کی شریمتی جی جو ہاتھ جوڑ کے راجہ باجپائے کو نمستے کر رہی تھیں۔ وہی گجراتن تھیں جن کی جالی کی ساڑی امجد کو پسند آئی تھی۔ ماتھے پر سہاگ کا چمکتا ہوا تارہ کندن کی دمک۔ رنگ بہت زیادہ گورا نہیں۔ مگر بلیچ۔ یوں بظاہر دیکھنے میں شیریں سے بھی کہیں کم عمر۔ ایک بڑی سی پیکارڈ میں راج رتن بھائی اور ان کی شریمتی جی بیٹھ گئیں۔

راجہ باجپائے کسی اور سے اپنی تین ہزار کی ہار کا ذکر کرنے لگے۔ امجد نے آہستہ سے نذیر سے کہا۔ "یہی تھے راج رتن بھائی جوہری؟

"ہاں"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کی شادی ہو چکی ہے۔"

"ہو چکی ہے۔"

"تو پھر شیریں؟"

راجہ باجپائے اب پھر نذیر کی طرف مخاطب ہو گئے تھے۔ "شیریں؟ کیا۔"

امجد نے کہا۔ "میں پوچھ رہا تھا کہ راج رتن بھائی کی شادی ہو چکی ہے۔ پھر شیریں کا کیا ہو گا؟"

راجہ نے کہا۔ "ابجی شادی تو راج رتن کی اب ہوئی ہے۔ کوئی دو مہینے ہوئے ہیں اور شیریں اس کے پاس سال بھر سے ہے۔ شیریں سے بیاہ کیسے ہو سکتا ہے جی بیوی تو اپنی ذات کی دیوی چاہیئے اور یہ شیریں تو ...... یوں ہی ...... کیا بتاؤں نذیر پچھلے ہفتے دو ہزار جیتا تھا۔ اس مرتبہ تین ہزار ہارا۔" اور اچھی طرح کھنکھار کر راجہ باجپائے نے اپنی حلق صاف کی۔

کالی رات

گرینڈ ٹرنک ایکسپریس دس گھنٹے لیٹ تھی۔ سکندر آباد کے پلیٹ فارم پر انتظار کرنے والوں کا اضطراب بڑھتا جاتا تھا اور جب سگنل گرا تو دلوں کی دھڑکن کئی گنی تیز ہو گئی اور بالآخر قاضی پیٹھ سے وہ گاڑی آ ہی گئی جس میں گرینڈ ٹرنک ایکسپریس کے دو ڈبّے کٹ کر حیدر آباد تک آتے ہیں۔ وہ تینوں اس ڈبّے کی طرف لپکے جس کے سفید تختے پر حیدر آباد لکھا ہوا تھا۔ ڈبے کی کھڑکیاں بند تھیں۔ ان تینوں کے دل ڈوب گئے۔ کسی کا جھانکتا ہوا چہرہ کسی کھڑکی سے نظر نہیں آیا۔ گاڑی دھکّا کھا کے ٹھہری تو ایک کمپارٹمنٹ کا دروازہ جو اچھی طرح بند نہیں تھا جھٹکے سے خود بخود کھل گیا۔

تینوں میں سب سے چھوٹے بھائی نے لپک کے کھلے ہوئے دروازہ کے اندر قدم رکھا۔ اوپر کی جالی پر ایک ٹوٹی ہوئی ٹوکری رکھی تھی۔ اس کے سوا کسی قسم کا سامان

نہ تھا۔ کوئی جاندار، کوئی آدمی اس ڈبے میں نہ تھا، اور فرش پر نشستوں پر، لکڑی کی دیوار پہ خون کے دھبّے ہی دھبّے تھے، جمے ہوئے سیاہ خون کے، جس پہ راستے بھر خاک اور غبار نے استرکاری کی تھی۔

اب باقی دونوں بھائی بھی اندر جھانک کے یہ منظر دیکھ چکے تھے۔ ناامیدی سے آخری مقابلے کے لئے اس امید کو برقرار رکھنے کے لئے کہ ممکن ہے وہ لوگ دلّی سے روانہ ہی نہ ہوئے ہوں، تینوں نے مسافروں کے نام پڑھنے شروع کئے۔ دھول سے اَٹے ہوئے کارڈوں پر نام صاف اور نمایاں تھے۔

مسٹر باقر علی خاں

مسز باقر علی خاں

مس باقر علی خاں

مسٹر سکندر علی خاں

اور قریب ہی فرسٹ کلاس کوپے پر جو کارڈ تھا۔ اس پہ دولھا دلہن کا نام صاف صاف درج تھا۔ مسٹر، مسز تہوّر علی خاں۔ کوپے کا دروازہ کسی رحمدل گارڈ نے مقفل کر دیا تھا۔

گارڈ آیا اور اس نے بیان کیا دہلی اور متھرا کے درمیان گرینڈ ٹرنک ایکسپریس پر حملہ ہُوا تھا۔ تینوں بھائیوں کے دل ڈوب گئے۔ جب صدمہ ایسا شدید ہو تو نشتر کی تیزی اپنا اثر یکبارگی نہیں کرتی۔ پہلے تو معلوم ہوتا ہے کہ اعصاب اور دماغ کی

سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ امید، ناامیدی کے یقین کے مقابل اپنا دھندلا سا چراغ جلتا رکھنا چاہتی ہے۔ ممکن ہے ان سب کے نام کے کارڈ لگ گئے ہوں۔ مگر یہ اس ٹرین سے روانہ نہ ہوئے ہوں، دہلی میں تین چار دوستوں، پاکستان کے ہائی کمشنر اور حکومتِ ہند کے ایک افسر کو جوابی تار دے کے تینوں بھائیوں نے یہ تصفیہ کیا کہ ان میں سے ایک سب سے چھوٹا غضنفر ہوائی جہاز سے دہلی جائے شاید کچھ سراغ ملے۔

اور جس وقت یہ تینوں بھائی اسٹیشن کے تار آفس سے تار دے رہے تھے۔ ایک سکھ ایک بابو سے پوچھ رہا تھا۔ بابو جی بنگلور کی گاڑی کس پلیٹ فارم سے جاتی ہے بابو نے اسے جلدی سے کچھ جواب دیا۔ اس سکھ کے کپڑے میلے تھے کیس اور پگڑی پر دھول جمی ہوئی تھی۔ صرف قمیص اور شلوار پہنے تھا۔ کمر کے گرد ایک پٹکا تھا۔ جس سے کرپان بندھی ہوئی تھی۔

وہ ٹہلتا ہوا دوسرے سکھ کے پاس آیا جس کا حلیہ اس سے ملتا جلتا تھا اور اس سے پنجابی میں کچھ کہنے لگا۔ پھر دونوں نے گٹھریاں اٹھائیں اور دو جھکی ہوئی برقعہ پوش شکلیں جو ان کے ساتھ تھیں انہیں کہنیاں ماریں۔ دونوں شکلیں ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔

خفیہ پولیس کے دو جوان دیر سے ان کی طرف تاک لگائے تھے، اب وہ ریلوے پولیس کے دو کانسٹیبلوں سمیت ان کے سامنے آ گئے۔

"سردار جی۔ تم سکھ ہو نا، تمہارے ساتھ یہ برقعے والیاں کیسی؟"

اکھڑ پنجابی میں ایک سکھ نے جواب دیا۔ "ہماری عورتیں پردہ کرتی ہیں۔"

خفیہ پولیس والوں کی تشفی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنے انسپکٹر کو پہلے ہی اطلاع کر دی تھی۔ کانسٹیبلوں نے کہا۔ "ہم ان عورتوں سے پوچھنا چاہتے ہیں۔ یہ کون ہیں"

اس مرتبہ سکھ نے اُردو میں جواب دیا۔ یہ عورتیں پنجابی جانتی ہیں اردو نہیں جانتیں اس پر حجت ہونے لگی۔ خفیہ پولیس کا ایک نوجوان ایک اسسٹنٹ سٹیشن ماسٹر کو بلا لایا جو پنجابی تھا۔ اس نے پنجابی میں پوچھا مگر عورتوں نے جواب نہیں دیا، اور اب دونوں سکھ ذرا ذرا بوکھلانے لگے۔

ریلوے پولیس کے انسپکٹر نے موقع پہ پہنچ کے ان دونوں عورتوں کو زنانہ ویٹنگ روم بھجوایا، وہاں جب ان عورتوں کے برقعے اتارے گئے تو دو خوبصورت جوان لڑکیاں نکلیں جن کے ہاتھ پیچھے کمر پہ بندھے ہوئے تھے اور جن کے منہ کو رومالوں سے بند کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک تو وہیں بیہوش ہو کے گر پڑی۔ دوسری نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے زنانہ ویٹنگ روم کی طرف دیکھ کر کہا۔ "پانی"

اور پھر ان لڑکیوں نے اپنا بپتا سنائی۔ وہ فیروز پور کے ایک زمیندار گھرانے کی لڑکیاں تھیں۔ شام تک افواہیں ہی افواہیں تھیں۔ رات کو ست سری اکال کے نعرے لگے، شور ہؤا، برچھے اور کرپان چمکے، باپ بھائی سب مارے گئے، یہ دونوں مالِ غنیمت بن گئیں، اور اس کے بعد یہ دونوں سکھ انہیں شہر سے شہر لئے پھرتے تھے۔

پولیس کی سختی پہ دونوں سکھوں نے بھی اقبال کیا۔ وہ چک لالہ کے قریب بڑھئی

کا کام کرتے تھے، دونوں بھائی تھے، مسلمانوں سے ان کا یارانہ تھا۔ پھر کچھ گڑبڑ شروع ہوئی، وہی جوان کے دوست تھے انہوں نے ان کا گھر لوٹا۔ ان کی عورتوں کو ان کے سامنے بے عزت کیا۔ ایک سکھ نے سسکیاں لے لے کے کہا کہ اس کے سامنے اس کی عورت کی چھاتی کاٹ ڈالی گئی اور اس کے بعد ان باقی ماندہ زخمی سکھوں کا سفر شروع ہوا۔ میلوں کا سفر، ہزاروں کا سفر، سفر جس میں بھوک تھی موت تھی طلب تھی۔ پھر آزاد پاکستان کی سرحد ختم ہوئی۔ آزاد ہندوستان کی سرحد شروع ہوئی۔ یہاں فیروز پور کے قریب لوٹ ہو رہی تھی۔ یہ بھی لوٹ میں شریک ہو گئے اور ان دو مسلمانوں کو لوٹ کا مال بنا کے لے چلے، انہوں نے سنا تھا کہ بنگلور میں فرنیچر اچھا بنتا ہے اور وہ ادھر ہی کے ارادے سے نکلے تھے۔

تینوں بھائیوں نے رات کو کھانا نہیں کھایا، تینوں کو یا تو نیند نہیں آئی یا ایسی نیند آئی جس میں اور بیداری میں کوئی فرق نہیں، ہر چیز غیر یقینی اور مبہم تھی، ہندوستان کے اخبارات سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ دہلی میں معمولی سا فساد ہے۔ پاکستان ریڈیو احتیاط برت رہا تھا، صرف بی بی سی سے دہشت ناک خبریں آتی تھیں اور ہندوستانی بھائی بی بی سی کی بدنیتی کا دکھڑا رو رہے تھے کہ دہلی کے اتنے معمولی سے واقعے کو افسانہ بنا دیا۔ یہ سب تھا مگر تینوں بھائی غیر جانبداری سے دہلی کے واقعات کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے، اس مرتبہ ان کی اپنی رگیں، نبضیں، اعصاب، خون کی گردشیں متاثر

تھیں، اس سے پہلے کلکتہ میں فساد رہا، بمبئی میں فساد رہا، وہ افسوس کرتے رہے غضنفر بمبئی تھا فساد ہوا۔ وہ سینما سے باہر نکلا تو چاروں طرف پتھر برس رہے تھے۔ ہندو پتھر اور مسلمان پتھر، بت پرستوں کے پتھر اور خدا پرستوں کے پتھر۔ اس نے یا علی مشکل کشا مدد کہہ کے ایکسلریٹر دبایا۔ ایک پتھر ونڈ اسکرین سے کوئی نصف انچ کے فاصلے سے نکل گیا۔ اُس نے ایکسلریٹر اور زور سے دبایا اور رلالایا نہ فارسی کا ایک فقرہ اس کے ذہن میں آیا جس پر وہ بچپن میں ہنسا کرتا تھا "یک ڈھیلا سن سنات من منات رسید کردم کہ اگر گجیا نہ مٹکائے تولیت تو سر شکستہ بود" سوڈے کی بوتلوں اور تیزاب سے البتہ ڈر معلوم ہوتا تھا۔ مگر یا علی مشکل کشا مدد، بمبئی میں فساد ہوا تو کیا ہوا۔ یہی نا کہ بسوں نے راستہ بدل دیا۔ بی، روٹ کی بسیں میرین ڈرائیو کے راستے چلیں۔ چلو سمندر کی ہوا کھاؤ۔ گلیوں میں کہیں فساد ہو رہا ہوگا۔ ہونے دو۔

پھر پنجاب میں فساد ہوا۔ کیا مارا ہے کیا مارا ہے۔ اس وقت تک یہ تین بھائی نہیں تھے، پانچ بھائی تھے۔ پانچوں خوش تھے کہ واہ وا مسلمانوں نے سکھوں کو کیا مارا ہے۔ ہندوؤں کو کیا مارا ہے، یہ سب پنجاب کی مسلم لیگ کا کارنامہ ہے، افتخار حسین خاں ممدوٹ کا، ان کا نہیں۔ اچھا تو پھر میاں افتخار الدین کا؟ اچھا وہ بھی نہیں تو پھر بیگم شاہنواز کا اور سر فیروز خاں نون کی انگریز بیگم، بھئی وہ تو غضب کی دلیر عورت نکلی، اچھا ان میں سے کسی کا نہیں؟ تو پھر یہ میجر خورشید انور کا کارنامہ ہے۔ بھئی ہم مانے لیتے ہیں۔ یہ پنجابی مسلمان کا کارنامہ ہے، اقبال کی وہ نظم ہے نا۔

اور اپریل میں جب غضنفر لاہور گیا تھا تو کیا دھاک تھی، مگر ہندو اور سکھ جوابی حملے

کی تیاری کر رہے تھے، وہ روپ شوری کا اسٹوڈیو دیکھنے ملتان روڈ پہ لاہور سے سات میل دور گیا۔ اسٹوڈیو وغیرہ سے دلچسپی کسے تھی، ان دنوں وہ کلجیت کور کے چکر میں تھا جس نے منورما کی جگہ سنبھالی تھی۔ بچارے شوری نے ایک اسٹوڈیو جلنے کے بعد دوسرا بنایا تھا اس کی ہمت کی داد دینی ضروری تھی۔ کیا اب بھی اس کی جورو ایکٹرسوں سے اتنا ہی جلتی تھی اور پھر سروپ شورنے اُسے دوسرے دن کھانے پہ بلایا۔ مال پہ اس چھوٹے سے ریستوران میں، کیا نام تھا اس کمبخت ریستوران کا وہاں وہ عجیب وغریب جوڑا تھا۔ سعید جس نے اس سکھ لڑکی شیلا سے پندرہ برس ہوئے شادی کی تھی۔

اور شیلا کا ہسٹریا۔ گرٹن کی تعلیم کو، کیمبرج کی قلعی کو، بین الفرقہ جاتی شادی، اور متاہل زندگی کو صرف چند ہفتوں کی اُس لڑائی نے ملیا میٹ کر دیا تھا جس میں اس کے ماں باپ کے فرقے پر اس کے شوہر کے فرقے نے عارضی طور پہ فتح پائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ غضنفر کم سے کم نام کی حد تک مسلمان ہوگا۔ پھر بھی اس نے پورک پر اصرار کیا۔ اس نے غضنفر سے پوچھا۔ وہ کس قسم کا مسلمان ہے۔ کریان (اعتقاد والا) یا پراتیکال (عمل والا) اس نے کہا اس مرتبہ وہ گولمرواڈی جائے گی۔ جہاں "تھینک ہیون ایک بورڈنگ ہاؤس کا اشتہار آیا ہے کہ صرف اعلیٰ درجے کے ہندو اور سکھ خاندان رہ سکتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا ہے کہ سعید بھی مسلم لیگیہ ہے۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے۔ ہم دونوں کا کوئی مذہب نہیں، ہماری سول میرج ہوئی ہے۔ ہم انسان ہیں۔" پھر ایک مشہور مسلمان لڑکی کا ذکر آیا تو وہ کہنے لگی۔" جانتے ہو وہ سعید سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں

نے سعید کو چھین لیا اور جانتے ہو، سکھ جو چاہتے ہیں لے کے رہتے ہیں۔"

اور اسی پارٹی میں رومیش چندر سے ——"جی ہیں وہ رمیش چندر نہیں جس کے مضامین پبلیز ایج میں آتے ہیں۔ وہ بمبئی والے رومیش چندر ہیں —— مگر ہیں بھی پارٹی کارکن ہوں، پارٹی آفس آیئے —— رُوپ کہہ رہی تھی۔" بھائی نان وایولنس آپ کا کیا خیال ہے۔ ایک پارٹی اگر وایولنس کرے یا نان وایولنس ......" بچارے روپ کی بچاری جلتی بھنتی ہوئی۔ ایکٹرسوں کی بازاری کشش کی دائمی رقیب گریجویٹ بیوی سے باتیں کرتے کرتے رومیش چندر نے غضنفر سے کہا۔ "آج میرے پاس بھی کچھ لوگ آئے تھے۔ کہہ رہے تھے مسلمانوں سے بدلہ لینا ہے۔ چار ہی آنے چندہ دے دو۔ میں نے پہلے تو انہیں سمجھایا جب انہوں نے کسی طرح نہیں مانا تو میں نے کہا۔ "مجھے تیس روپیہ تو تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں سے تمہیں کیا دوں۔"

پھر باتوں باتوں میں کسی نے کہا۔ "نہنگ۔"

غضنفر نے پوچھا۔ "نہنگ کیا؟"

رومیش نے جواب دیا۔ "جی یہ ذرا سرپھرے سکھ ہوتے ہیں، معلوم ہے امرتسر کے ہنگامے کے متعلق یہ کیا کہتے ہیں، جب مسلمانوں نے حملہ کیا یہ لوگ کسی میلے میں گئے تھے ورنہ مزہ چکھا دیتے۔" اور پھر رومیش پورے ہندوستان کی مجموعی حماقت پر ہنسا۔

"اور سکھ۔" مسز سعید نے کہا۔ "اور اب یہ دعویٰ ان کانوں سے سننا پڑتا ہے۔ کہ مسلمان بھی بہادر ہو سکتے ہیں۔"

"وایولنس، نان وایولنس۔"

"پرِ وتما داس گپتا۔"

"میں نے اپنے کانوں سے پاکستان ٹائمز کے دفتر میں سردار شوکت حیات خاں کو میاں افتخار الدین سے یہ کہتے سنا کہ سکھوں نے بارہ لاکھ کی جیپ اور لاریاں خریدی ہیں۔"

"پٹیالہ"

"بہاول پور"

"ہم لوگوں نے یہ طے کیا تھا کہ تانگوں ہی پہ نہ بیٹھو پیدل چلو، لاہور کے سارے سب تانگے والے مسلمان ہیں۔"

"ہلجیت کور"

"نہیں کافی نہیں، کچھ نہیں ......"

اور ٹرین پر جب وہ ایک فرضی نام ڈی سلوا بنا کے شملہ جا رہا تھا تو وہ لالہ جی کس مزے سے تیاریوں کا ذکر کر رہے تھے۔ "لاہور میں ہم صرف دفاعی لڑائی لڑیں گے لیکن امرتسر سے لیکر دہلی تک ایسا مزہ چکھائیں گے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔"

شملہ میں غضنفر کا اصلی نام سب کو معلوم تھا لالہ جی اُسے آخر تک ڈی سلوا ہی کہتے رہے، خیریت ہوئی ورنہ بیچاروں کو کیسا صدمہ ہوتا کہ دشمن سے سارا کچا چٹھا کہہ دیا تھا۔

رات غضنفر کو باقی دونوں بھائیوں کی طرح نیند نہیں آئی، کس قدر واہیات

کالی رات

بے معنی مہمل سی بات تھی کہ شام کو گرینڈ ٹرنک ایکسپریس کا ڈبہ اس کے ماں باپ بھائیوں کے خون سے رنگا ہوا تھا اور وہ سروپ شوری کی پارٹی اور پنجاب کے ہنگاموں کی دوسری قسط کی تیاری کے قصے یاد کر رہا تھا۔ لیکن نشتر چبھتا رہا اور دماغ کو بے معنی مہمل چیزوں کی یاد آتی رہی اور اگست کی آخری تاریخوں میں امجد —— اپنے آپ کو آزاد مسلمان کہتا ہے نیشنلسٹ۔ کسی نے مجھ سے پوچھا کہ یہ آزاد مسلم کیا ہوتے ہیں۔ میں نے کہا مادر پدر آزاد —— امجد نے کہا دیکھو اب مشرقی پنجاب میں تمہارے مسلمان پٹ رہے ہیں، اب دیکھو ہندو اور سکھ کیسی مار مار رہے ہیں۔

امجد پر اس کا خون کھولنے لگا اور نشتر پھر جگر کے آر پار ہو گیا۔ ماں باپ، بھائی بہن ریل کے ڈبے میں خون کے چھینٹے، خون کے چھینٹوں پر گرد، کارڈوں پر نام، ناموں پر گرد۔

ہندوستان کی تمام ریل گاڑیوں میں کوئی گرینڈ ٹرنک ایکسپریس سے زیادہ نامعقول نہیں۔ جس طرح ترکی یورپ کا مردِ بیمار تھا۔ یہ گریٹ انڈین پینن سولا جیسی ریل گاڑیوں کی نرن بیچارہ ہے، کوئی سیاسی بحران ہو کوئی ہنگامہ؟ سب سے زیادہ اثر اس پر ہوتا ہے۔ اس کے وجود کی ذمہ داری اور کئی حماقتوں کی طرح مرحوم سر اکبر حیدری پر ہے جنہوں نے قاضی پیٹھ اور بلہار شاہ کے درمیان لائن بنوائی۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک تو یہ ایکسپریس منگلور سے مدراس ہوتی ہوئی پشاور تک سسکتے ہوئے

سانپ کی طرح رینگ جاتی تھی، پھر انتہائی شمال اور انتہائی جنوب کی کمپنیاں اس کے رینگنے اس کی مکوڑا چال سے عاجز آ گئیں۔ یہ صرف مدراس سے دہلی تک لنگڑاتی ہوئی چلتی رہی مگر ہر قدم پہ بیمار، کوئی اور ٹرین گذرنے والی ہو یہ بچاری چھوٹے موٹے اسٹیشن پر بھکاریوں کی طرح کھڑی ہے۔ ۱۹۴۲ء کے ہنگاموں میں تو اس کا حال ہی نہ پوچھو۔ چوبیس چوبیس گھنٹے لیٹ ہو جاتی تھی۔ بھلا کہیں یہ ممکن تھا کہ بھارت ماتا کو آزادی کا سرسام ہو جائے اور گرینڈ ٹرنک ایکسپریس اس سے متاثر نہ ہو۔

پرانی دلّی کے اسٹیشن پہنچ کے میر باقر علی خاں اور ان کے اہل وعیال کی جان میں ذرا جان آئی، کہ اب دلی سے نکلے اور جان بچنے کی امید بندھی۔ پلیٹ فارم نمبر ۹ پر ان کے وطن جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ شہر میں جو ہنگامہ تھا اسٹیشن بھی اس سے متاثر تھا۔ مگر اتنا زیادہ نہیں، پولیس بہت تھی اور اسے دیکھ کر ڈھارس بندھتی تھی۔ وہیلر کے بک اسٹال پہ سستے رسالے اور ان سے زیادہ سستے ناول اسی طرح پڑے تھے، قلی اسی طرح ٹھیلے دھکیل رہے تھے۔ مدراسی رجمنٹ کے سپاہی پتوں میں دال چاول کھا رہے تھے، پلیٹ فارم پہ اسی طرح تھوک، قے اور ہر طرح کی مرکب غلاظت کا لیپ تھا۔ ای۔ آئی۔ آر کے ہرڈبے اور بی بی اینڈ سی آئی کے ایرکنڈیشنڈ ڈبوں کو دیکھ دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہاں بھی تمدن دم توڑ رہا ہوگا، ان سب کی نشستیں محفوظ تھیں، وہ دو دن کے بھوکے پیاسے تھے۔ مگر اسٹیشن پر انہیں کچھ کھانے کو تو ملا اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ سکھ اور کچھ غنڈے جو غالباً راشٹریہ سیوک سنگھ کے ہوں گے

ڈبوں کے اطراف چکّر مار رہے تھے، مگر اب وہ ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے، کوئی دم میں ریل چلے گی اور وہ ان غنڈوں کے دسترس سے باہر ہو جائیں گے۔

وہ خود بچ گئے تھے۔ یہ ایک معجزہ تھا۔ ان دو دنوں میں انہوں نے کیا کیا دیکھا، اور کیا کیا سنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو ایک خاص واقعے سے دلچسپی، عبرت اور وحشت تھی۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک ہولناک واقعے کو اس پورے خواب پریشاں کی انتہا سمجھ کے چن لیا تھا۔

بلوچ رجمنٹ کے سپاہی جو انہیں موت کے منہ سے نکال لائے تھے انہیں کیسے کیسے واقعات سنا گئے تھے۔ سکینہ کا دل لرز اُٹھا۔ وہ ریل کے ڈبے کے گارڈ کی مس باقر علی خاں تھی۔ بیس سال مثنویوں اور غزلوں کی معشوقہ سے چھ سال بڑی سا اس چھ سال کے عرصے میں اس نے بی۔ اے کر لیا تھا اور بی ٹی کی تیاری کر رہی تھی۔ ان فسادات کے زمانے میں وہ اکثر سوچتی رہتی کہ ابسن کی ہلڈا کی طرح کیا سچ مچ اٹھا کے لے جائے جانے میں لطف آتا ہو گا۔ پھر اسے مزید تفصیلات کا علم ہوا اور یہ لطف ختم ہو گیا۔ مثلاً ایک بلوچی سپاہی نے اس کی موجودگی میں اس کے باپ کو یہ قصہ سنایا کہ اکثر عورتوں کو خراب کرنے کے بعد ان کی چھاتیاں کاٹ ڈالی جاتی ہیں یا کرپان سے ان کے شکم کو چیرا جاتا ہے، یا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ عورت کے سامنے اس کے مرد یا باپ بھائی کو مارا جاتا ہے اور ان کے اعضا اس کے منہ میں گھسیڑے جاتے ہیں۔ ابسن کی ہلڈا کے

وائکنگ بہت شریف تھے، وہ عورتوں کو اٹھا کے چھوٹی چھوٹی طاؤس نما کشتیوں میں امریکہ کی سیر کرانے لے جاتے تھے جہاں سے ابھی تک ہالی وڈ کے فلم، آتشک کے جراثیم، اور امریکی سیاح پرانی دنیا نہیں آئے تھے۔

سکندر پر ایک اور خاص واقعے کا اثر تھا۔ میر درد روڈ پر ایک چھوٹے سے مکان میں دو بہنیں اکیلی رہ گئیں، دروازے ہی پہ عابدہ کا شوہر مارا گیا۔ عابدہ حمل سے تھی، وہ کہیں بھاگ نہ سکی لیکن زاہدہ کوٹھے پر چڑھ کے منڈیر سے دبک گئی اور نیچے تماشہ دیکھتی رہی، کچھ لوگ سامان نکالتے اور لوٹتے رہے، چبوترے پر عابدہ ننگی کی گئی۔ اس کے اطراف سات آٹھ وحشیوں کا ہجوم تھا، جن کی داڑھیاں اور پگڑیاں ان کی خباثت کا جزو معلوم ہوتی تھیں۔ عابدہ حمل سے تھی۔ ایک ایک کر کے انہوں نے عابدہ کو خراب کیا یہاں تک کہ اس کی چیخیں گھٹ گئیں، سسکیاں بند ہو گئیں، آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ وہ بے حس و حرکت ہو گئی۔ زاہدہ سے دیکھا نہیں گیا مگر وہ دیکھتی گئی وہیں اوپر سے منڈیر کی آڑ سے اور جب وہ ساتوں آٹھوں اپنا منہ کالا کر چکے تو وہ تین تو ہائیں ہائیں کرتے رہے مگر ان میں سے ایک نے کرپان کھینچ کے شرمگاہ سے حلق تک عابدہ کا جسم چاک کر دیا، زاہدہ کی نگاہوں کے نیچے دنیا گھوم گئی۔ یہ زمین یہ دھرتی ماتا چکر کھانے لگی اور چکر ذرا تھما تو اس نے ایک ہی لحظہ کے اندر طے کر لیا کہ تھے کیوں، اگر وہ گرے تو اس طرح گرے کہ کسی کے ہاتھ نہ آئے، مثلاً خون میں لت پت ہونے کی وجہ سے عابدہ کتنی کراہت بھری معلوم ہو رہی تھی ——— اس کی سگی بہن سہی ——— عابدہ۔

میری آپا۔ چشمِ زدن میں زاہدہ نے پھرتی کر لیا۔ چبوترہ پتھر کا تھا، اگر وہ سر کے بل کود دے تو کلیجہ پاش پاش ہو جائے گا۔ ان حیوانوں میں سے کوئی تو اسے ہاتھ نہ لگائیگا چشمِ زدن میں اس کا بھیجہ پاش پاش ہو گیا۔ ایک فاتح نے دوسرے سے "سوہنی کڑی" کے متعلق کچھ کہا، دوسرے نے اُسے جواب میں ماں کی گالی دی کہ اس کی صورت تو پہچانی نہیں جاتی تجھے کیا معلوم سوہنی تھی یا کیسی تھی، جب بلوچ سپاہی تخلیہ کرانے پہنچے۔ تو بہت دیر ہو چکی تھی اور سکندر نے ان دو نامعلوم بہنوں کے نام عابدہ' زاہدہ رکھے' یہ نہ سہی کوئی اور نام سہی۔ اصغری، اکبری، جمال آرا، حسن آرا، ناہید جہاں، خورشید جہاں ...... کوئی نام سہی .... ان کا انسانی حافظہ میں زندۂ جاوید ہونا ضروری ہے۔

دہلی اور متھرا کے درمیان ریل گاڑی رُکی۔ روک لی گئی۔ اس سے پہلے بھی ریل گاڑیاں رکی ہیں۔ ہزاروں مرتبہ۔ سگنل نہیں گرا، بھینسیں گزر رہی ہیں۔ کسی نے زنجیر کھینچ لی، کیا ہؤا۔ ہؤا یہ کہ سینکڑوں راہزن تھے۔ چمکتی ہوئی کرپانوں کا میلہ لگا ہؤا تھا راشٹریہ سیوک سنگھ والے اسٹاف کا کام کر رہے تھے۔ اہم ترین کام یہ تھا کہ مسلمانوں کو ریل سے اتار لیا جائے۔ معلوم ہوتا تھا چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے ہزاروں بار و سفر اتارنے والے کیڑے اُبل آئے اور انہوں نے انسانوں کی ہیئت اختیار کر لی "جے ہند" "ست سری اکال" "جے بلی دیو"۔ شور پکار۔ شکار کا شور۔ قصابوں کا نعرہ، بکروں کی آوازیں۔ جو اتر نہیں رہے تھے۔ ان پہ ویسے ہی کرپانوں اور تلواروں کے وار ہو رہے تھے

تہور نے اپنے کوپے کو اندر سے مقفل کر لیا تھا۔ کھٹ کھٹ کھٹ اور گالیاں اس کی نئی نویلی دلہن جو ہفتہ بھر پہلے بیاہ کے آئی تھی اس سے چمٹ گئی۔ معرکہ کربلا میں شادی کا سماں تھا، ہزاروں انیس اور دبیر مرثیے پڑھ رہے تھے، مرثیے، نوحے، سوز کربلا ہی کربلا۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ مگر اس وقت زندگی کے کوئی آثار نہ تھے، کوئی امید نہ تھی، چھن سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا۔ دلہن جس کی مانگ کی افشاں پر پسینہ کے بڑے بڑے قطرے ابھر آئے تھے جیسے تارے غرقاب ہو جائیں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اب تہور اور اس کی دلہن اور ان باہر کے وحشیوں کے درمیان صرف وینے شین کھڑکی حائل تھی۔

تہور نے اپنا ریوالور کٹ بیگ سے نکالا۔ "دو چار کو مارے بغیر تو یار لوگ مریں گے نہیں۔ نظام الملک آصف جاہ کی فوج کا نام بدنام نہ ہوگا۔" صرف چار گولیاں تھیں۔ یہ ریوالور بھی دلی میں کس مصیبت سے بچا تھا۔ ایک اور یورش میں وینی شین بھی نیچے گری۔ ایک شخص نے کھڑکی کے اندر منہ ڈالا۔ اور تہور سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اترو" تہور نے اسے ڈانٹا۔ ایک اور سکھ نے کرپان کھینچ کے مارا جو تہور کے بائیں ہاتھ میں لگا۔ تہور نے یکے بعد دیگرے دو فائر کئے، دو آدمی گرے۔ لیکن دو گولیاں بھی ختم۔ اور کچھ لوگ اس کے ڈبے کی طرف جھپٹے۔ اس نے خود کھڑکی سے دیکھا کہ دو آدمی اس کی بہن کو پکڑے لئے جا رہے ہیں، جھپٹ کے اس نے وینی شین پھر جلدی سے بند کر لی اور جو حملہ آور جھپٹے تھے پھر وینی شین کو گرانے کی کوشش کرنے لگے۔

"بتول"

دلہن نے اس کی طرف دیکھا۔ دلہن کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے محبت کی کپکپی تھی۔ اب خوف کی اور موت کی۔

"تم موت سے تو نہیں ڈرتیں۔ یہ لوگ تمہیں بہرحال زندہ نہ چھوڑیں گے۔"

اور دلہن نے صرف اتنا کہا۔ "میں عزت کے لئے ڈرتی ہوں۔"

"ابھی دو گولیاں باقی ہیں۔"

دلہن نے آہستہ آہستہ سر ملایا۔ دیپی شین پر حملہ آوروں کی یورش بڑھ گئی۔ اس نے اپنے پورے جسم کا بار دیپی شین پر ڈالا کہ وہ نہ کھلنے پائے۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے، اس کی دلہن اس سے لپٹ گئی اور اس کے ہونٹوں سے اپنے ہونٹ مل کے اس نے آہستہ سے کہا۔ "تمہیں جناب امیر علیہ السلام کے سپرد کیا۔"

"اللہ حافظ"

"اللہ حافظ"

اس نے ریوالور کی نال اپنی دلہن کی کنپٹی پر رکھ کر لبلبی دبا دی، دلہن کے دونوں ہاتھ جو اس کی گردن میں حمائل تھے چھوٹ گئے، خون اور بھیجہ ملا چلا۔ اس سے دیکھا نہیں گیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ کتنی خوبصورت تھی، میں نے اسے چاہا اور اسے مٹا دیا۔ اور اتنے میں اس کے جسم کے بار کے باوجود دیپی شین گری اور ایک کرپان پیچھے سے اس کی پسلیوں کے آر پار ہو گیا۔ حملہ آور سکھ نے اسے ماں کی گالی دی۔ اور جھک کے کوپے کے بند دروازے کی سٹکنی کھول دی۔ سامان کی لوٹ شروع ہو گئی۔

کالی رات

اور تہور علی خاں کے ریوالور کی آخری گولی بے فائدہ باقی رہ گئی۔
اس کے والد میر باقر علی خاں کے کمپارٹمنٹ کا زیادہ برا حشر ہؤا۔ جب اس ڈبے میں سکھ گھسے تو پہلا وار انہوں نے سکندر پر کیا۔ وہ گھائل ہو کے گرا۔ پھر انہوں نے باقر علی خاں کی بیوی کو مارا اور آخر میں باقر علی خاں کو۔ جب ایک نے سکینہ پر کرپان اٹھایا تو راشٹریہ سیوک سنگھ کے ایک سورما نے کہا۔ "نہیں جی۔ یہ بڑی سندر لڑکی ہے۔ اسے رہنے دو۔ اسے ہم شدھ کریں گے۔ کیوں ری لڑکی چلے گی تو؟"
لڑکی اپنی ماں کی لاش سے لپٹ کر رو رہی تھی اور ماں کے خون سے اس کے کپڑے تر تھے۔ پھر راشٹریہ سیوک سنگھ کا وہ سورما ساتھی اس لڑکی کو پکڑ کے جھاڑیوں کی طرف لے گئے۔

وہ زندہ ہے یا مردہ۔ احساس کی رو اس قدر سست تھی کہ سکندر کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا اُسے مردہ جان کے ریل گاڑی سے کھینچ کے کسی نے نیچے ڈال دیا تھا کہ سامان لوٹنے میں اس کی لاش حائل نہ ہو۔ احساس کی رو اس قدر سست تھی کہ اسے زندگی کا کم ہی احساس ہؤا۔ اس نے ہاتھ ہلانا چاہا معلوم ہوتا تھا سیدھا ہاتھ اب کبھی اس کا ساتھ نہ دے گا۔ سر میں برابر دھماکے ہو رہے تھے، مسلسل دھماکے، آنکھوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ لیکن کچھ کچھ اندھیرا رات کا بھی تھا۔ جس میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں پستہ قد بھوتوں کی طرح دور دور کھڑی تھیں۔ اس نے سیدھے ہاتھ سے ناامید ہو کے بائیں ہاتھ کو ہلانا چاہا، اس نے کچھ دیر قوتِ ارادی کا ساتھ دیا۔ پھر بے جان ہو کے

کسی چیز پہ گر پڑا۔ گھاس جیسی ریشہ ریشہ چیز پہ، یہ کسی لاش کی داڑھی تھی۔ اس نے لاش کے منہ پہ ہونٹوں پہ ہاتھ پھیرا، غیر ارادی طور پہ اور عین اس وقت گیدڑوں کی آواز آئی گھگی ہوا ہوا ہو جیسے انسان کے مہمان آپہنچے۔ کس زبردست پیمانے پر ان کی ضیافت کی تیاری کی گئی تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ خوف کی تیز لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی کے اس سرے تک محسوس کی۔ جب اپنا سیدھا ہاتھ بغاوت کرے اور بایاں ہاتھ پوری طرح قبضے میں نہ ہو اور ٹانگیں (غالباً) کسی مری ہوئی عورت کی زلف گیر میں الجھی ہوئی ہوں۔ تو گیدڑوں کے تیز دانتوں کا مقابلہ کون کرے گا۔ اس سے تو کرپان ہی اچھے تھے۔

آسمان پہ چار، پانچ تارے تھے۔ اور یہ کالی رات خوبصورت تھی۔ ایک بانکی تلنگن سی تھی جس کا کالا کالا روپ اس پورے خون آشام منظر پہ چھایا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگا، اور سب کا کیا حشر ہوا؟ سر کے دھماکے تیز ہو گئے۔ اتنی تکلیف تھی، اتنا رنج تھا۔ پھر بھی ایک جدائی تھی۔ جب یہ تکلیف یہ رنج انتہا کو پہنچا اور پھر احساس ہو گیا۔ اور سب کا کیا حشر ہوا، ماں باپ، بہن کا، بھابھی کا، بھائی کا؟ اس تاریک رات میں اتنی لاشیں پڑی ہیں۔ کونسی لاش کس کی ہے؟ اُس نے سر گھمانا چاہا، اور ایسا سخت درد ہوا گویا کسی نے گردن مروڑ دی۔ اور اتنے میں گیدڑوں کی آوازوں سے زیادہ بھاری ایک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ یہ کوئی اور ریل گاڑی تھی۔ پھر نئے قاتل، نئے مقتول؟ نہیں یہ چھوٹی سی ٹرین فوجیوں کی تھی جو زخمیوں اور مردوں کو لے جانے آئی تھی۔ اس نے انجن کی روشنی دیکھی۔ معلوم ہوتا تھا سر کے اندر ریل کے پہیئے گھسے جا رہے ہیں۔

کالی رات

سر میں پھر ایک زور کا دھماکا ہؤا اور احساس کی رو کہیں ڈوب گئی ......

دو لالٹینیں اس کے قریب بھی رکھیں۔ وہ بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر نے کہا یہ مرا نہیں۔ اسٹریچر پر اٹھا کے اس کی زندہ لاش وہاں سے اٹھائی گئی اور اسے کچھ ہوش نہ تھا۔

وہ رات، وہ بانکی تلنگن پشاور سے لیکر سہارنپور تک بڑے خون آشام حسن سے چھائی ہوئی تھی۔ ایسی تاریک راتوں کو غلام ہندوستان کے بیٹے رنڈیوں کے کوٹھوں پر جایا کرتے، اب پشاور سے سہارنپور تک کسی کو رنڈی کے کوٹھے پر جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی، وہ عورت جو پیسے سے خریدی جاتی تھی۔ اب تلوار کے زور سے خریدی جا رہی تھی۔ سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، محبت کے لئے، نفرت کے لئے، انسانیت کے لئے، بہمیت کے لئے —— عورت کے بغیر مفر نہیں۔ اب اس کے بچوں کی کسی کو ضرورت نہیں تھی، وہ بھالوں، سنگینوں، برچھوں، تلواروں سے چھد کر تڑپ تڑپ کر سو گئے تھے۔

اور دفعتاً کالی رات، بانکی تلنگن، اپنی تاروں بھری افشاں لہرا کے سمٹی، اس نے انگڑائی لی۔ ہوا چلی۔ جھاڑیوں کے پتے سرسرائے۔ رات نے لاشوں سے اپنا تعارف کرایا۔ مجھے پہچانتے ہو میں قرونِ وسطیٰ سے اور اس سے پہلے کی صدہا صدیوں کی آتی ہوں۔ میری آغوش میں تمہارا نطفہ قرار پایا۔ تم نے جنم لیا، تم رینگے، تم گھٹنیوں کے بل چلے، تم کھیل کود کے پڑھ لکھ کے جوان ہوئے۔ تم نے بیاہ کئے۔ جھوٹ بولا کئے، اپنے ساتھیوں کو اپنے آپ کو دھوکا دیا کئے۔ اور آج میری ہی آغوش میں تم اس

طرح پڑے ہوئے ہو کہ کبھی نہ اٹھو گے ——

کیونکہ میں صرف دائمی، تاریخی مُدامی رات نہیں ہیں والپرگس رات ہوں، جب بھتنیاں ناچتی ہیں اور جادوگرنیاں جھاڑوؤں پر سوار ہو کے ملاء اعلیٰ کی سیر کرتی ہیں میں والپرگس رات ہوں۔ اور میرا شباب ابھی پُر بہار ہے، ابھی تم نے کیا دیکھا ہے۔ تم جو محض ایک معمولی سے راہگذر حادثے سے فنا ہو چکے۔ میں جادو بھری رات ہوں۔ والپرگس رات ہوں میں ہندوستانی معشوقہ کی زلف ہوں۔ اس کی آنکھ کی پتلی ہوں، میں مشرقی شاعر کی شبِ دیجور ہوں، شبِ فراق ہوں، میں تم سے کیا بتاؤں کہ اپنی ہزاروں آنکھوں سے میں نے ملتان، راولپنڈی، لاہور، امرتسر، جالندھر، گڑگاؤں، دہلی اور دہرہ دون میں کیا کیا دیکھا۔ ابھی میں اور کیا کیا دیکھوں گی۔

ہسپتال میں جب سر اور گردن کے زخم پر پٹی باندھی جا رہی تھی، اور ایک سو پانچ کے قریب بخار تھا۔ سکندر کے لاشعور نے اس تاریک رات کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کیا۔ ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک، ایک تاریکی سے دوسری تاریکی تک، یہاں تک کہ سیڑھی ختم ہو گئی اور آسمان بھی بہت دور تھا۔

تب والپرگس رات سے اس نے گڑگڑا کے کرسمس کا ایک جرمن کیرول دہرایا۔ "ہائی لی گا نافٹ، شون نافٹ" (مقدس رات۔ خوبصورت رات) ہسپتال کی دیوار پر کوئی تیز روشنی پڑی۔ ممکن ہے اس روشنی کی کرن اس کے دماغ ہی سے نکلی ہو۔ وہ سیڑھی کے سب سے اونچے زینے پر کھڑا تھا اور سیڑھی ہوا میں ادھر سے ادھر جھول رہی تھی

کہ اتنے میں جادوگرنی کی جھاڑو رات نے اس کے حوالے کر دی۔ اور بھی کتنی لاشیں تھیں جو جھاڑوؤں پہ بیٹھی آسمان کی نیلاہٹ کی طرف جا رہی تھیں۔ نہیں، مگر اسے تو نیچے زمین کی طرف اترنا تھا۔

اس کا پورا جسم پلاسٹر میں بندھا تھا۔ وہ کروٹ نہیں لے سکتا تھا۔ ذہنی طور پر اس نے کروٹ لی اور تکیے کو ٹانگ کے نیچے دبا کے پلنگ کی پٹی کو بھینچ کے سو گیا۔ کالی رات کی طرح اس کے لاشعور نے اس کے بیمار جسم سے تھوڑی دیر کے لئے بچ نکلنے کے لئے ایک انگڑائی لی اور عام انسان کے لاشعور میں ضم ہو گیا۔

اب وہ پھر سیڑھی کے سب سے اونچے زینے پر کھڑا جھول رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ سیڑھی اب گری، اب گری، دور دور تک کسی جادوگرنی کی جھاڑو کا پتہ نہ تھا۔ یہاں تک سکینہ کا، بتول کا، کسی کا پتہ نہ معلوم ہوتا تھا تمام لاشیں جو جھاڑوؤں پر بیٹھی آسمان کی نیلاہٹ کی طرف جا رہی تھیں، اب وہاں پہنچ گئیں۔ تمام طائران بام حرم اپنے کابکوں میں بیٹھے آرام سے غٹرغوں کر رہے تھے۔ اور وہ اسی طرح سیڑھی کے سرے پر، اب گرا، اب گرا۔

اور عام انسان کا لاشعور اس کے بیمار لاشعور کو پھر ہسپتال اس کے پاس بھیج کے سیڑھی پر اکیلا جھولنے لگا۔ اس سیڑھی پہ وہ کتنے ہزار سال کی مشقت سے چڑھا تھا۔ اس نے کتنے حربے ایجاد کئے تھے، کیسے کیسے اوزار تراشے تھے، اور اب یہ سیڑھی جھول رہی تھی۔ گرنے کے قریب تھی، پشاور سے سہادن پور تک، ہیروشیما سے لیک سیکسس تک

اس خطرے کے عالم میں جبکہ سیڑھی ٹوٹ کر گرنے کے قریب تھی اس عام انسان نے اعتراف کیا میں انسان ہوں، میں وہی ہوں جو ارتقا کی سیڑھی کی اتنی منزلیں طے کرکے یہاں پہنچا ہے۔ زندگی کے مرکز سے حیات کے کتنے مظاہر نکلے! لیکن ایک محیط پر پہنچ کر سب کے سب رک گئے۔ میں اکیلا تھا جس نے اس محیط کو پار کیا۔ میں نے جبلت کو چھوڑ کے عقل کا راستہ پکڑا۔ میں نے موٹی کھال اتار دی، کپڑے بنائے، میں نے سانپوں کی پرستش کی اور سانپوں کو مارا، میں نے بیل کو، گھوڑے کو بھاپ کو، بجلی کو، جوہر کو اپنا غلام بنایا، لیکن میں نے اپنے آپ کو بھی اپنا غلام بنایا، میں نے اتنا سب کیا، پھر بھی میں کتنا مجبور رہوں۔ اس وقت تک ایک اسپیشل ٹرین شرنارتھیوں سے بھری گوجرانوالہ سے آرہی ہے۔ میں ہی اس ٹرین میں ہوں اور آزادی، خود ارادیت اور اطمینان کی طرف جا رہا ہوں۔ میں ہی اس ٹرین پر برین گن، اسٹن گن، مشین گن سے موت کی بوچھار کر رہا ہوں۔ میرے ہی دماغ سے، میرے ہی ارادے سے وہ تمام قیاسات، حسابات، اعمال، افعال پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے فطرت میری غلام ہے اور میرے ہی ارادے سے تلوار اٹھتی ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور ایک لمحے کے اندر سب غائب فنا ہی فنا۔

اور تب انسان کے ارادے اور عمل اور قوت اور تخیّل نے اپنی جڑیں ساری کائنات میں پھیلائیں نہ صرف روشنی بلکہ ہر قسم کی توانائی جیسے حرارتی، برقی، مقناطیسی توانائی کا وزن بھی ہوتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ توانائی اور مادہ اصل میں ایک ہی

چیز کی مختلف حالتیں ہیں اور ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔" یہ کہہ کے آئن شٹائن کا شاگرد خاموش ہو گیا۔

کیسی توانائی، کیسا مادہ، پناہ گزینوں کی ٹرین ایک اندھیاری گلی سے دوسری اندھیاری گلی جا رہی تھی، جو فوجی افسر حفاظت کے لئے مامور تھا اس نے اپنے صوبیدار میجر سے کہا۔ یار اس ڈبہ میں وہ عورت بڑی خوبصورت ہے۔ اگلے اسٹیشن پر دو چار سپاہیوں کی مدد سے صوبیدار میجر اس بیس سال کی حسین عورت کو اپنے افسر کے لئے اور سترہ اٹھارہ سال کی ایک اور سانولی سی لڑکی کو اپنے لئے اتار لایا اور اس کے ساتھی روتے گالیاں دیتے رہ گئے، اور جب ٹرین سرحد کے پار پہنچی تو ڈاکٹروں نے معائنہ کیا کہ دونوں عورتوں کے جسم سوج گئے ہیں۔

اے انسان دیکھ کسی دن یہ ذی مفاصل کیڑے، یہ چیونٹیاں، یہ شہد کی مکھیاں، یہ مکڑیاں تجھے شکست دیں گی۔

اخلاقی فضیلت نہ انسان کے اندر جوں کی توں ودیعت کی گئی ہے اور نہ اس کی فطرت کی مخالف ہے۔ اگر اخلاقِ انسانی فطرت کے بنے بنائے موجود ہوتے تو ان کے حصول کا کوئی مسئلہ بھی پیش نہ آتا اور جبلت کے خلاف ہوتے ان کا حصول ناممکن ہوتا حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاق کے حصول کی صلاحیت فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے۔ یہ ایک بالقوہ صلاحیت ہے، اس کے بالفعل آنے کے لئے صرف علم نہیں بلکہ عادت کی ضرورت ہے۔

اچھا۔ یہ بات ہے۔ اور آپ کا اسمِ شریف؟ ارسطو۔ اچھا آیئے میں آپ کو انسان کے اخلاق کی سیر کراؤں۔ دیکھئے یہ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی کی ایک گلی ہے، یہ دیکھ رہے ہیں آپ یہ فوج کے سپاہی ہیں، اور ان کے پیچھے پیچھے یہ دس، بارہ، پندرہ مادر زاد ننگی لڑکیاں چلی آ رہی ہیں۔ ان کے ہونٹ خشک ہیں، ان کے بال الجھے ہوئے ہیں، ان کے ننگے پیر جھلس چکے ہیں۔ ان لڑکیوں میں دو تین ایسی بھی ہیں جنہوں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ ان میں سے کسی کا جسم تو کیا کسی کا چہرہ بھی کسی غیر مرد نے نہیں دیکھا تھا، ان کے جسم سڈول ہیں اور ان میں جوانی کا رس بھرا ہے، یہ شریف لڑکیاں کہلاتی تھیں۔ اور اس لئے مرغیوں کی طرح ڈربے میں بند رکھی گئیں کہ شریف بچے پیدا کریں، اب تو انہیں دیکھ رہا ہے ارسطو، یہ کیا ہے؟ تو اپنی آنکھوں پر ہاتھ کیوں رکھے لے رہا ہے؟ اور اور ایک ذرا تیز لڑکی نے جو پہلے بڑی شوخ و شنگ ہو گی پلٹ کے ارسطو سے کہا "دیکھ ہمیں اچھی طرح دیکھ، ہمیں سیکڑوں مرد خراب کر چکے ہیں، آ تو بھی خراب کر لے"۔

کورو کشیتر میں سری کرشن نے ارجن کو عمل کی تعلیم دی، دسویں ادھیائے کے دوران میں اس نے کہا کہ میری ذات ہر شے کی خلاق ہے۔ مجھ ہی سے ہر ایک شے نکلتی ہے جنہیں اس حقیقت کا عرفان ہے۔ مجھ ہی سے دھیان لگاتے ہیں۔ وہ میرے ہی آرزو مند ہیں، میری ذات سے ہم آہنگ ہیں میرے نغمۂ عشق کا سامان ہیں جو لوگ اس طرح میری محبت میں ڈوبے ہیں انہیں بدھی کا یوگ بخشتا ہوں۔

لاکھوں شرن ارتھی اسی کورو کشیتر کے میدان میں جمع تھے۔ جیسے زمین کے نیچے چیونٹیاں، جیسے دیمک، جیسے حشرات الارض، ہیضہ، بیماریاں، سرشام آدمیوں کا ایک

سیلاب تھا جو سینکڑوں میل سے مختلف دھاروں میں بہتا چلا آیا تھا اور یہاں اس کا بند سا باندھ دیا گیا تھا، راستے بھر یہ انسان دن کو چلتے رہے، لٹتے رہے، راتوں کو ٹھہرتے رہے، لٹتے رہے، ان کے بچے ذبح کئے گئے، ان کے جوان مارے گئے، ان کی عورتیں چھینی گئیں۔ پھر انہوں نے سرحد پار کی اب سردار پٹیل اور مہاراجہ پٹیالہ کی عملداری تھی، اب دن کو یہ چلتے رہے، لوٹتے رہے، چھاپے مارتے رہے، راتوں کو ٹھہرتے رہے، لوٹتے رہے، چھاپے مارتے رہے، بچوں کو ذبح کرتے رہے، جوانوں کو مارتے رہے، عورتوں کو پکڑتے رہے، جس طرح ٹڈی دل آ کے ہزارہا میل تک کھیتوں کو صفا چٹ کر دیتے ہیں انہوں نے ہندوستان کی انسانیت، اخلاق، تہذیب کو ختم کر دیا۔

انہوں نے فاقے کئے، ہوائی جہازوں سے روٹیاں برسیں، اب اپنے اس مصنوعی شہر، پانڈوؤں اور کوروؤں کی اس رزمگاہ میں ان کی روحیں فاقہ کر رہی ہیں، عفونت غلاظت، سڑاہند، ایک کیمپ آفیسر نے اپنے پرانے ساتھی فوجی افسر سے کہا ان لوگوں سے ناک میں دم ہے، کسی کی بیٹی پاخانے جا رہی تھی، کسی نے اس کی چھاتیاں دبا دیں۔ وہ فریاد لے کے آیا۔ کوئی کسی کی جورو پر چڑھ بیٹھا۔ وہ فریاد لے کے آیا۔ کسی نے اپنے ہم فرقہ جھگڑے والے کو لوٹ لیا۔ چلو اب پولیس سے جھگڑا کرو۔

رات، بانکی تلنگن نے ایک اور انگڑائی لی۔ اور اس کے افشاں کے تارے ایک ایک کر کے کم ہونے لگے اور تب انسان کے شعور نے وہ سیڑھی جس کے سب کے اوپر کے زینے پر وہ جھولا جھول رہا تھا، ایک کنوئیں میں لٹکا دی جو لاشوں سے بھرا ہوا تھا، ممکن

ہے کوئی لاش پھر سے سیڑھی کے تمام زینے چڑھ کے اوپر کے زینے تک پہنچ جائے اور انسان کا شعور پھر سکندر کے لاشعور میں ضم ہو گیا، جو پلاسٹر میں بندھا ہوا ایک سو پانچ بخار میں بھنتا ہوا ہسپتال میں اپنے بستر پر بستر کی عظیم الشان وسعت میں ذہنی کروٹیں بدل رہا تھا

غضنفر دوسرے ہی دن دکن ایرویز کے ہوائی جہاز سے دلی روانہ ہوا۔ امید کے خلاف اُمید کا دیا جھلملاتا رہا۔ یہ ساری آگ ہمارے لیڈروں نے لگائی ہے۔ اس آزادی سے اس تقسیم سے، اس پاکستان سے، اس ہندوستان سے کیا مل گیا۔ اجاریہ کیا شاندار نام ہے اور اکساؤ، اور اکساؤ ملک —— ارے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ چنگیز اور ہلاکو مسلمان نہیں مسلمانوں کے قاتل تھے، ان کی پیروی کی دھمکی دینا کیا ضروری تھی۔ اس دن میاں بشیر احمد سر سے ہاتھ لگائے بیٹھے تھے کہ پنجاب لیگ کے صدر اور معتمد میں یہ حجت تھی کہ فسادات کے مقابلے کے لئے کون زیادہ چندہ دے اور نتیجہ یہ کہ کسی نے چندہ نہیں دیا اور پھر ان سب سے بڑھ کے اکی دکی داستان، اس داستان کا خیال آتے ہی اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کی یاد کی خلش ذرا کم ہوئی، پریشانی سے دماغ میں جو الجھاؤ تھا وہ ذرا کم ہوا اور وہ خود مسکرانے لگا۔ یہ اکی دکی داستان۔ اس کا جواب شاید ہی ملے......

اور ہوائی جہاز میں اونگھتے اونگھتے غضنفر نے سوچا۔ کیا یہ لاکھوں اس لئے مرے کہ یہ لوگ حکومت کریں۔ پاکستان پر، ہندوستان پہ...... یہ مزے اڑائیں اور انسان مارے جائیں۔ اور میرے اپنے ماں باپ، بھائی بہن...... ہوائی جہاز اتر رہا تھا۔ نربدا بڑی

شان و شوکت سے ایک گندے نالے کی طرح نیچے بہ رہی تھی۔ ایک پہاڑ زن سے ہوائی جہاز کے نیچے سے آ کر گزر گیا اور بھوپال کا تال، ایک چوڑے سے نیلے نگینے کی طرح نظر آیا۔ اس کے بعد گوالیار پھر دہلی۔

دہلی پہنچ کے غضنفر نے ایک لمحہ رائیگاں نہیں کیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں اس کے کافی دوست تھے۔ وہ ایک ہندو دوست کے ہاں ٹھہرا۔ وہ موقعہ واردات پر گیا جہاں اس نے اپنی ماں، باپ تہوّر اور بتول کی لاشیں پہچانیں۔ کٹی، سڑی، گلی لاشیں، سکینہ کا کچھ پتہ نہیں چلا ــــــ اور اب تک پتہ نہیں کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر جھاڑیوں کے جھنڈ میں ایک نوجوان لڑکی کی برہنہ لاش تھی۔ سیکڑوں جانوروں کی ہوس سے پامال جسم سوج گیا تھا، اور درندوں نے اس کے بیہوش جسم کو تنہا چھوڑنے سے پہلے ایک بڑے سے پتھر سے اس کا چہرہ اور سر کچل دیا تھا۔ لاش پہچانی نہ جا سکتی تھی۔ غضنفر جس نے پندرہ سال پہلے سے اب تک اپنی بہن کو ریشم میں ملبوس دیکھا تھا کیونکر پہچان سکتا کہ یہ جوان لڑکی کون تھی، پھر مہینوں بعد جب خواجہ شہاب الدین کا بیان اخباروں میں چھپا کہ ایک گریجویٹ لڑکی ایک اَن پڑھ کمہار کی کنیز اور داشتہ کی حیثیت سے زندگی گزار رہی ہے، تو تینوں بھائیوں کی نبضیں تیز ہوئیں اور پھر ڈوب گئیں، مگر وہ تو کپور تھلہ کا ذکر تھا، اور وہ لڑکی کوئی پنجابی لڑکی ہو گی جو پاکستان پہنچا دی گئی ہو گی۔

پھر وہ ہسپتال گیا اور اس نے اپنے بھائی سکندر کو دیکھا جو گردن اور سر کے زخم سے بیہوش سرسام کے عالم میں تھا۔

کالی رات

سکندرِ اعظم۔ ارسطو کا شاگرد۔ ارسطو نے فوجیوں کی حفاظت میں برہنہ عورتوں کو دیکھ کر آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیئے۔ ہزارہا سال پہلے اس نے سکندر سے کہا تھا۔ ساری دنیا کو فتح کر، سکندر، ارسطو، انسانِ کامل۔

کالی رات آئی۔ بانکی تلنگن۔ مانگ میں تاروں کا افشاں، پیشانی پر چاند کا جھومر، انسان جو سیڑھی کے سب سے اونچے زینے پر فضا میں جھول رہا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور انسانِ کامل ہونے کا دعویٰ کیا۔ جاننا چاہیئے کہ انسان کامل بذاتِ خود جمیع حقائق وجودیہ کے مقابل ہے۔ وہ اپنی لطافت میں حقائق علویہ کے مقابل ہے اور کثافت میں حقائق سفلیہ کے مقابل ہے۔ حقائق خلقیہ سے اوّلاً جو چیز اس کے مقابل ہے وہ عرش ہے، ارتقا کی سیڑھی سے انسانِ کامل عرش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیکھو میں برق کا پیغامبر ہوں میں۔ ایک بڑا سا قطرہ ہوں جو ابر سے ٹپکا ہے۔ برق بہر حال انسانِ کامل ہے، یوں کہا زرتشت نے۔

پاکستان اور ہندوستان کی سرحد پہ ایک معبد میں جو معلوم نہیں مسجد تھا یا گوردوارہ یا مندر یا کلیسا، ایک عورت کی لاش سڑ رہی تھی اور جہاں سے دیوی ماتا انسان کو کائنات کو، انسانِ کامل کو جنم دیتی ہے، وہاں ایک کتاب کا ورق، بہیمیت اور قتل کے بعد ٹھونس دیا گیا تھا۔ ذرا ہندوستان کے وزیر اعظم اور پاکستان کے قائدِ اعظم کو بلاؤ۔ اس کالی رات میں شاید وہ پڑھ کر بتا سکیں کہ یہ ورق کس مقدس کتاب کا ہے۔ قرآن مجید کا؟ مقدس وید کا گرنتھ صاحب کا؟ انجیلِ مقدس کا؟ کمیونسٹ مینی فسٹو کا؟ برگساں کی ارتقائے تخلیقی کا؟

شرما کے انسانِ کامل نے سیڑھی پھر اس کنوئیں میں لٹکا دی جس میں لاشیں سڑ رہی تھیں اور نیچے اترنا شروع کیا۔ اس زینے پر جہاں ورندے تھے ——— اس زینے پر جہاں حشرات الارض تھے جہاں لاشوں میں بلبلاتے ہوئے کیڑے تھے اور پھر انسانِ کامل معدوم ہو گیا۔

جب غضنفر ماں باپ کی اور اس نامعلوم لڑکی کی لاش سپردِ خاک کر کے آیا، تو ہسپتال میں سکندر سرسام کی حالت میں ختم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "بڑا افسوس ہے... ......اس کی جان بچانے کی ہم نے بہت کوشش کی۔"

○

بے کار دن، بے کار راتیں

ایک بیکار تو وہ ہوتے ہیں۔ جن کی آنتیں بیکار ہوتی ہیں، اور آنتیں اس لئے بے کار ہوتی ہیں کہ کھانا نہیں ملتا، اور کھانا اس لئے نہیں ملتا کہ ان کا تعلق اس طبقے سے ہوتا ہے جس کو کھانے کے لیئے محنت کرنا اور کمانا پڑتا ہے، اور محنت اس لئے نہیں کرتے کہ یا کاہل ہوتے ہیں اور نہیں کرنا چاہتے، یا کرنا چاہتے ہیں اور کام نہیں ملتا۔ میری بیکاری اس کی قسم کی نہیں۔ میری آنتیں بیکار نہیں۔ میرا دماغ بیکار ہے، میرا ضمیر بیکار ہے۔ اور وہ اس لئے کہ سات پشتوں سے میرے اجداد نے کبھی کمانے کے لئے محنت نہیں کی۔ انہیں ایک بڑی اچھی ترکیب سوجھی تھی۔ محنت دوسرے کریں اور کھائیں وہ خود میرے اجداد نے قانون بنائے کہ وہ جو ان کے لئے محنت کرتے ہیں خود کھانے سے محروم رہیں، اخلاق ایجاد کیئے۔ جنہوں نے ضمیر کو بے ہوش کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ میرے

آباو اجداد کے پاس اتنا روپیہ آگیا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ میرے مکان کا جتنا رقبہ ہے اُتنے ہی رقبے میں سو ڈھیڑوں کی جھونپڑیاں ہیں، اور جھونپڑیوں کی مجموعی آبادی پانچ سو کے قریب ہے۔ جن میں سے ہر سال کوئی سانپ کاٹے سے مرتا ہے، بیس پچیس ہیضہ یا طاعون کے نذر ہو جاتے ہیں۔ دس بارہ ٹائیفائڈ سے مرتے ہیں اور دس بارہ ان جڑی بوٹیوں اور طرح طرح کے علاجوں سے جو ٹائیفائڈ سے اچھے ہونے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ یہ ڈھیڑ اُبلے ہوئے چاول یا جوار کی روٹی کے ساتھ مرچیں کھاتے ہیں۔ اب جنگ کے زمانے میں تو دن میں دو مرتبہ لیکن اس سے پہلے دو دن میں ایک مرتبہ ہم لوگ چار پانچ کورس کا کھانا جنگ سے پہلے کھاتے تھے۔ اب جب سے حضور وائسرائے بہادر نے خود چاول کھانا چھوڑ دیا ہے، ہم نے بھی چاولوں کا استعمال بہت کم کر دیا ہے، صرف دعوتوں اور تقریبوں میں چاول کھاتے ہیں۔ جب دس دس سیر پلاؤ پکتا ہے۔

میرے لئے بیکاری کا سوال بڑا اہم ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وقت کس طرح کاٹا جائے۔ میرے اجداد کو اتنی زحمت نہ اٹھانا پڑتی تھی۔ وہ صبح کو اُٹھتے کھاتے تھے، پھر دودھ میں جلیبیاں ڈال کے کھاتے، پھر صبح کے نو بجے سے دوپہر کے کھانے کے وقت تک شطرنج کھیلتے رہتے۔ دوپہر کا کھانا کھا کے چار پانچ بجے تک قیلولہ کرتے، پھر شطرنج اور گنجفہ میں منہمک ہو جاتے۔ ملاقاتی یا اہلِ غرض آتے تو ان سے چاپلوسی کی باتیں سنتے رہتے اور خوش ہوتے جاتے۔ رات کا کھانا کھا کے، بچوں کو

سوتا اور بیوی کو کوستا چھوڑ کے رنڈیوں کا گانا سننے چلے جاتے۔ دو تین بجے رات کو واپس آتے، اور دوسرے دن پھر وہی ......

میری بیکاری کا مسئلہ بالکل مختلف ہے۔ میں نے تعلیم پائی ہے اس لئے میں صبح سے شام تک شطرنج یا گنجفہ نہیں کھیل سکتا۔ لوگ کیا کہیں گے۔ اور اپنے جدِ مرحوم کی طرح دن بھر لنگی باندھے خواصوں کے ہجوم میں بیٹھنا میرے بس کی بات نہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ کبھی کبھی شادی بیاہ میں، یا کبھی اپنے کسی مقطعے پر رنڈیوں کا گانا سن لوں تو بہت ہے، مگر ایک مرتبہ بھی میں محبوب کی مہندی میں دیکھ لیا جاؤں تو لوگ کیا کہیں گے۔ اب لوگ اسی بات کو معیوب سمجھتے ہیں۔ مجھے پڑھنے کا بالکل شوق نہیں رائڈر ہیگرڈ اور ...... دیکھئے اس کا نام بھی بھول گیا ـــــ بہرحال سراغ رسانی کے ناول پڑھ لیتا ہوں۔ مگر جب سے تیرتھ رام فیروزپوری کے ترجموں پر نظر پڑی، میں نے انگریزی میں ناول بھی پڑھنے چھوڑ دیئے۔

ایک زمانے میں سوچا گیا کہ سیاسیات میں حصہ لوں۔ لیکن اگر کبھی جیل خانے بھیج دیئے گئے تو یہ لیجئے یک نہ شد دو شد۔ یوں میرے بہت سے دوست اور جان پہچان کے نواب ہیں، حیدرآباد میں بھی اور حیدرآباد کے باہر بھی۔ لیکن یہ اپنی اپنی ہمت ....

بس جناب گذشتہ سال اسی بیکاری سے تنگ آ کے میں راجہ باجپائے کے ساتھ بمبئی پہنچا۔ مجھے راجہ باجپائے کی طبیعت بہت پسند ہے۔ کیا دوست آدمی ہے،

سیر چشم، مہمان نواز، سچا راجہ۔ بس اس کی ایک عادت مجھے سخت ناپسند ہے، کھنکھارنے اور تھوکنے کی۔ آپ سے اچھی خاصی طرح باتیں کرتا ہوگا۔ ایک دم سے برآمدے جا پہنچے گا اور باہر گملوں میں جہاں کہیں موقعہ ملے گا گلا صاف کرکے، کھنکھار کے تھوک آئے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جھوٹ بولنے میں راجہ کا جواب کم ہے۔ لیکن راجہ صرف دو ہی موقعوں پر جھوٹ بولتا ہے۔ جب دوکاندار اپنے بلوں کی ادائگی کا تقاضا کریں، تب راجہ ایسی میٹھی میٹھی باتیں کرکے ٹالتا ہے، ایسے اچھے اچھے وعدے کرتا ہے کہ حیرت معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ راجہ کے یہاں کھانے پر کسی سچ مچ کے والی ریاست کی دعوت ہو۔ لیکن نوکروں کی کوٹھریوں کے پاس یا صحن میں یا کسی دور دراز برآمدے میں دو چار تقاضا کرنے والے دوکاندار ضرور موجود ہوں گے جن کو راجہ نے "ابھی" چیک دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اور یہ 'ابھی' آج سے کل میں، دنوں سے مہینوں میں، مہینوں سے برسوں میں بدلتا رہتا ہے، اور عجیب بات ہے کہ قرض دینے والوں اور دوکانداروں کی آس نہیں ٹوٹنے پاتی۔ راجہ صاحب کے اور بھی کئی سنہری اصول ہیں مثلاً گریٹ ایسٹرن ہوٹل کا بل تین ہزار ہو تو وہ ادا کریں یا نہ کریں مگر ہوٹل کے منیجر اور نوکروں کو سینکڑوں روپے انعام ضرور دیں گے۔

دوسرا موقعہ جب راجہ صاحب جھوٹ بولتے تھے، مبالغے کا ہوتا تھا۔ سابق وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے مجھ سے کلکتہ کی کرسمس پارٹی میں کہا۔ "راجہ صاحب…." اور پھر بڑے آدمیوں سے بے تکلفی کی ایک داستان سنائی جاتی۔ راجہ صاحب یوں

اعلیٰ سوسائٹی میں مقبول تھے بھی، مگر مبالغہ ان کی گفتگو اور ان کی شخصیت کی جان تھا۔ باقی رہ گیا قرض تو راجہ صاحب کی جاگیر کی آمدنی قریب قریب چار ہزار روپیہ ماہانہ تھی، چاہتے تو اچھی طرح رہ سکتے مگر ان کا ماہانہ خرچ آٹھ ہزار سے زیادہ تھا......

جنوری کا پہلا ہفتہ تھا، اور پونا کے مقابل بمبئی میں گرمی پلیٹ فارم پر اترتے ہی معلوم ہوتی۔ کچھ اچھی صورتیں تھیں۔ اور جب ہم راجہ صاحب کے آبائی مکان پہنچے جو ہارکنس روڈ پر تھا۔ تو ملا بار ہل سے سمندر ابلتا ہوا نیلا اور بڑا خوبصورت معلوم ہوا چار منزل کی ایک ہری عمارت سمندر کے کنارے گھوم سی گئی۔

بھولا بھائی ڈیسائی کے یہاں پارٹی میں سندھ کے ایک مسلمان لیڈر نے اپنے ساتھی سے کہا "کل ہی رات کو جناح صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے کہا مسلم لیگ کے پیچھے ابھی تک نظریہ اور خیال کی طاقت نہیں ہے۔ جناح صاحب نے کہا قرآنِ پاک میں سب کچھ ہے۔ میں نے کہا تو پھر اسی سے نظریہ، خیال اور طاقت کو اخذ کیجئے۔ قرآن ہی کی بنیاد پر جدید سیاسی نظامات سے منطبق کر کے کوئی ایسا اساس بنائیے۔ جناح صاحب نے کہا۔ اقبال نے اس کی کوشش کی ہے...... میں نے کہا اقبال کے تصورات کے پیچھے بھی معاشی نظام کی طاقت نہیں......"

اتنے میں مسز سروجنی نائیڈو آئیں اور سب اٹھ کھڑے ہوئے اور سندھ کے لیڈر صاحب ان سے گاندھی جی کی صحت کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔

خان بہادر نواب علی امداد خاں ریاست برہان پور میں پرائم منسٹر رہ چکے تھے، اور ابھی دو مہینے ہوئے تھے کہ انہیں بھی اپنا اصطبل جمانے کا خبط سمایا تھا۔ جنگ کے زمانے میں ٹھیکہ داروں نے امیر ہوتے ہوتے انہیں بھی بہت امیر کر دیا تھا اور ایسے ہی کسی الزام کی بنا پر پولیٹیکل ایجنٹ نے انہیں نکلوایا تھا۔ وہ اس وقت میرے عنبر بان راجہ باجپائے کے پاس گھوڑوں کی خرید کے متعلق گفتگو کرنے آئے تھے۔ راجہ صاحب ابھی غسلخانے میں نہا رہے تھے، کھنگھار رہے تھے، تھوک رہے تھے۔ علی امداد خاں کے جانے سے کچھ ہی دیر پہلے مہتاب جنگ آئے، سراپا تبسم، سراپا سوسائٹی کے محبوب، ریاستوں کے مشیر۔ علی امداد خاں سے بڑے تپاک سے ملے، مگر ان کے جاتے ہی ان پر تبصرہ شروع کیا۔ "اگر علی امداد خاں اچھی طرح چلتے تو کسی بڑی ریاست کے وزیر اعظم ہو جاتے۔ مگر دیکھیے"

اور پھر راجہ صاحب سے مخاطب ہو کے مہتاب جنگ نے کہا۔ "ریاستوں سے تو بھئی اب میرا دل بھر گیا ہے۔ اب کشمیر، حیدر آباد، بھوپال کہیں جانے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ میں بھی جب تک کوچ خزاں میں دیوان رہا، رہا۔ میرا اصول رہا کہ مہاراجہ اور مہارانی سے انتہا درجے کی ذاتی وفاداری۔۔۔۔۔ راجہ یہ وفاداری ریاست کی خدمت کی جان ہے، مگر پھر حالات بدل گئے۔ موجودہ حضور سکرٹری کا بدلا جانا ضروری ہے۔ میرے خیال میں تو حضور سکرٹری کی خدمت ہی تمام رجواڑوں میں سرے سے ختم کر دی جانی چاہیے۔ اب دیکھیے علی امداد خاں کا کیا ہوا۔ ان سے امداد—

خان بہادر رفیق سے رقابت تھی۔ دونوں کی پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف سازش کرتی رہیں۔ اب علی امداد خاں کو تو آپ جانتے ہی ہیں، مرحوم سر علی امام کھلم کھلا کہا کرتے کہ یہ نوجوان بڑا ہونہار ہے مگر قابلِ اعتماد نہیں۔ خان بہادر رفیق اُدھر حضور سکرٹری کی خوشامد کر رہے تھے، اور ان سے اندر ہی اندر یہ طے کر رہے تھے کہ خود پرائم منسٹر ہو گئے تو حضور سکرٹری کو ہوم منسٹر بنا دیں گے۔ اب رہ گیا پولیٹکل ایجنٹ۔ شروع شروع تو وہ علی امداد ہی کا طرف دار تھا، مگر پھر حالات بدل گئے......"

اتنے میں لنچ کا وقت آ ہی گیا، اور نواب مہتاب جنگ نے گملٹ کا گلاس ٹرے پر رکھ دیا۔

شام کو میجر نذیر کے ساتھ سی سی آئی گیا، جہاں ایک بڑا سا گول میدان دیکھا، کچھ لوگ دیکھے جو تاش کھیل رہے تھے...... میرے آبا و اجداد کی طرح....، ایک نہانے کا حوض دیکھا جس کی تہ میں پچی کاری کا کام دیکھا، اور صرف ایک خوبصورت عورت دیکھی۔ میرین ڈرائیو پر ٹہلتے ٹہلتے، اور کئی کئی منزلوں کے گھروندے فلاں نواس اور فلاں نواس دیکھتے دیکھتے میجر نذیر کو ریویرا کی یاد آئی۔ امجد نے آلڈس ہکسلے اور بیورلی نکلس کا ذکر کیا۔ جن کے نام میں نے سنے ہیں مگر ان کی کوئی کتاب کبھی نہیں پڑھی۔

دوسرے دن اولگا کو ٹیلیفون کیا۔ اولگا کی ایک اور دوست تھی، سیلون کی رہنے والی، سیہ فام حسن کا نمونہ، کالی گھٹا مگر خوبصورت اور اس سے نذیر کی دوستی تھی نذیر برابر اپنے کپڑوں کی طرف متوجہ تھا، اور نذیر کی خاطر مجھے اولگا سے اس لنکا کی بیٹی کا پتہ پوچھنا پڑا۔ وہ کسی اور لڑکی کا ذکر سن کر چونکی تو میں نے وجہ بتائی "میرے ایک دوست ہیں میجر نذیر وہ اس لڑکی کو جانتے ہیں"...... اس پر اولگا نے چھوٹتے ہی کہا "تو ایسا کیوں نہ کرو۔ شام کو چھ بجے آجاؤ، اور اپنے ساتھ اپنے دوست کو بھی لیتے آؤ، ڈرنکس کے لئے میں کرشنا کو بھی بلوا لوں گی......"

جب میں نے ٹیلیفون کا ریسیور رکھا تو نذیر نے پتلون کی کریز ٹھیک کرتے ہوئے کہا "کرشنا...... ہاں کرشنا ہی اس سنگھالیز لڑکی کا نام تھا۔ دیکھو مجھے یاد ہی نہ آتا تھا......"

نذیر میرے مقابل بدرجہا خوبصورت ہے' اس لئے جلن کے مارے میں نے راجہ باجپائے کو بھی ساتھ لیا۔ تاکہ اولگا کو نذیر سے بات چیت کرنے کا موقعہ زیادہ نہ ملے۔ اور راجہ باجپائے کو میں نے اولگا کا حال سنایا، اس کا باپ بیجاپور میں سول سرجن تھا اور اڈوانی اس زمانے میں اس کا اسسٹنٹ تھا، اڈوانی کی صورت دیکھی ہے؟ دانت چوتھائی انچ ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے۔ خیر وہ اولگا پر عاشق ہوا تو ایک بات بھی تھی، مگر اولگا کو اس میں کیا خاص بات نظر آئی ہو گی؟ پھر ہزار میں ایک مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی ہندوستان میں رہتے ہوئے انگریز افسر کی لڑکی ہندوستانی سے

شادی کرے۔ خیر راجہ تم اس سے مل کر خوش ہو گے۔ کہہ رہی تھی ذرا بیمار ہے۔ اُسے
پلیورسی ہو گئی۔ کرنے کو تو اس نے اڈوانی سے شادی کر لی، اب گھٹ رہی ہو گی۔

چھ بجے کے فوراً بعد عمداً ذرا دیر سے ہم تینوں وارڈن روڈ پہنچے۔ اولگا نے ہمیں اوپر اپنی خوابگاہ میں بلا بھیجا، چوڑے بستر پر ہلکا سا پلش اوڑھے ہوئے، وہ نیم دراز تھی۔ میں بھی نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اتنی بیمار ہو گی کہ اُتر کے نیچے بھی نہ آ سکے گی۔ اس نے معافی چاہی اور کہا ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے کی اجازت نہیں دی۔

وہ دو سال پہلے کے مقابل اب دبلی معلوم ہو رہی تھی، مریضہ مگر بڑی ہی دلکش اس کے اوسط ہموار دانت، اس کے مڑے ہوئے ترشے ہوئے ہونٹ، اس کے خدو خال کی دلکشی ــــ واپسی پر نذیر اور باجپائے دونوں نے اس کے حسن کا اعتراف کیا

نذیر کی سنگھالی، کالی چنگاری کوشا بید کی آرام کرسی پر نیم دراز آنکھیں آدھی کھلی آدھی بند۔ نذیر کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ مجھ سے وہ بالکل غافل ہے۔ راجہ صاحب وہسکی اور سوڈا کے سوا اور ہر چیز سے قطعی بے پروا ہیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اولگا اور کسی طرف متوجہ نہ ہونے پائے اور اس سلسلے میں ایک مصنوعی احساسِ برتری ــــ یعنی اصلی احساسِ کمتری ــــ کا شکار ہوں۔

اتنے میں اولگا کا شوہر آتا ہے، کم رو، کم نظر، کم سواد۔ حسن اور بدشکلی کے قبضے میں۔ اور یہاں معاشی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو نفسیات کی غلطی ہے۔ اور دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ اولگا بھگت رہی ہے، اپنے ماحول کو بھگت رہی ہے۔ یہ زندگی

جس کا اس نے غلطی سے انتخاب کیا، اور اس کا غلط انتخاب جس نے اُسے فرنیش کر دیا
یہ دونوں اس کا خون چوس رہے ہیں۔ ڈاکٹر اڈوانی نے آکے تعارف کے بغیر اپنے
مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور پھر اولگا نے میرا تعارف کرایا اور میں نے نذیر اور باجپائی
کا۔ ڈاکٹر اڈوانی اپنی بیوی کے قریب لیٹ گیا۔ مہمانوں سے اخلاق کی کچھ باتیں کیں۔
اٹھا اور بہانہ کیا کہ کسی مریض کو دیکھنے جانا ہے، وارڈروب سے کپڑے نکالے،
اور نیچے کے کمرے میں جا کے غالباً روز کی عادت کے مطابق سنگترے کی پھانکوں کا
آملٹ چائے کے ساتھ کھانے لگا۔

ہم لوگ بھی تھوڑی دیر کے بعد اٹھے، مگر پھر بھی جانے کو جی نہیں چاہتا، کمرے
کھڑے باتیں کرتے رہے۔ کرسمس کا درخت معنوی طور پر مرجھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کمرے
پر ایک طرح کی مونث تنہائی طاری تھی۔ صرف کرشنا کی آنکھوں کی سفیدی، اس کی
جلد کی سیاہی کے بحر ذخار میں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح چمک رہی تھی۔ اور آہستہ
آہستہ ہمارے دلوں نے ارادہ کر ہی لیا، اور دروازے کی طرف ہمارے قدم
واپس ہوئے۔ تنہا خاتون، تنہا کمرے میں تنہا رہ گئی۔ کرشنا کی آنکھوں کی چمک
کے باوجود۔

پھر ہم تاج گئے۔ جہاں ہندوستانی وہسکی کے ساتھ بھنی ہوئی مونگ پھلیاں ملتی
ہیں، اور نیچی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی ہیں۔ جہاں ہز مجسٹی کے بحری بیڑے کے کچھ
جہاز ابھی تک ہندوستان کے ساحل کی پاسبانی کر رہے ہیں، دروازے کے قریب

وسطِ یورپ کی ایک بیودن ایک گورے چٹے ہندوستانی سے باتیں کر رہی ہے ایک موٹا تازہ، گورا آکارہنے والا، موسیقی کا بادشاہ پیانو بجارہا ہے، طوفانی انداز میں اور حاضرین اگرچہ کہ زیادہ تر انگریز ہیں، تالیاں بجارہے ہیں۔ ہز مجسٹی کی بحری فوج کے افسر بہرحال بہ آوازِ بلند گاگا کے اپنی خوشنودی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہندوستانی وہسکی میرے سر پر چڑھتی چلی جارہی ہے، لیکن ابھی پیانو خلا میں تیرنے نہیں پاتا کہ راجہ باجپائے کھنکھارتے ہیں، اور تھوکنے کے لئے بار بار کے باہر پھولوں کا اسٹال کتابوں کے اسٹال کے اس پار سیڑھیوں کی طرف چلے جاتے ہیں، اور بحری افسروں کے گیت کے شور سے الگ اور واضح نذیر کی آواز آتی ہے اب چلنا چاہیئے۔

کئی دن بعد کا ذکر ہے، شام کو وہ آئی جس کا نام میں نہیں بتا سکتا۔ سرسری سی ملاقات کے لئے۔ بلند بالا، خوبصورت، اور اس کے ہلکے سانولے چہرے پر نمک ہی نمک ہے۔ چہرے پر نمک تھا، اور معلوم ہوتا تھا کوئی چیز شکن در شکن ٹوٹ رہی ہے۔ اس کے باوجود اس کے سرخ لبوں، اس کی رس بھری کالی کالی آنکھوں اور اس کے چہرے کے اس شکن در شکن "نمک" میں کوئی بے آہنگی، بیگانگی نہ تھی۔ وہ یقیناً خوبصورت تھی۔

اسے پرنام کر کے میں ہٹ گیا۔ اور وہ راجہ باجپائے سے باتیں کرتی رہی۔ پھر شام اور گہری ہوگئی تو میری طبیعت بیٹھے بیٹھے اور زیادہ گھبرانے لگی۔

مجھے نواب مہتاب جنگ کی علالت کی اطلاع ملی تھی، خیال کیا کہ انہیں دیکھ آؤں شام گہری ہو رہی تھی اور آفتاب کے تیز سے ڈھلتے جا رہے تھے۔ مہتاب جنگ سیٹھ ہارون یعقوب کے یہاں مہمان تھا، جو آجکل اپنے جوہو والے مکان میں نہیں بلکہ کوینز روڈ والے فلیٹ میں مقیم تھے، جس کے سامنے سے تھوڑی دیر کے بعد بی بی اینڈ سی آئی کی گاڑیاں کھڑ کھڑ کرتی گذر جاتیں؛ اور سڑک پر ہر لحظہ بیسیوں موٹروں کے ہارن برقی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے۔

مہتاب جنگ بستر پہ رضائی اوڑھے پڑے تھے۔ رضائی سر سے لپٹی ہوئی تھی، اور ان کا چہرہ، رضائی سے باہر نکلا ہوا بڑا اچھا، بھولا بھالا معلوم ہو رہا تھا۔ ابھی ابھی انھوں نے ڈپتھیریا کا انجکشن لیا تھا۔ کہنے لگے سیٹھ ہارون یعقوب کا بیان ہے۔ کہ "اگر بمبئی میں حلق میں ذرا تکلیف ہو یا حلق میں سیمت پیدا ہو جائے تو ڈپتھیریا کا بڑا اندیشہ رہتا ہے۔"

میں نے پوچھا کہ سیٹھ صاحب کہاں ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ مالا بار ہل کی طرف گئے ہیں۔ میں سمجھ گیا امجد کے پاس گئے ہوں گے۔ امجد کے ساتھ مل کے وہ گوداوری کے علاقے میں آہنی سامان بنانے کا ایک کارخانہ کھولنے کی تجویزوں میں غرق تھے۔

نواب مہتاب جنگ کہنے لگے۔ "میری عمر ایسی زیادہ نہیں۔" (ان کی عمر صرف باون سال کی ہے) "میں نہ بیکار بیٹھ سکتا ہوں، اور نہ اب کسی ریاست میں کام کرنے کی ہمت ہے۔ میرا بھی ارادہ ہے کہ کوئی کاروبار شروع کروں، مگر کون سا

کاروبار شروع کروں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ یار اس دربارداری نے کہیں کا نہ رکھا۔"

سیٹھ ہارون یعقوب کا یہ فلیٹ بڑا آراستہ پیراستہ تھا۔ تمام فرنیچر آرمی اینڈ نیوی کا بنوایا ہوا۔ سلیقہ ذرا کم ہی کم تھا، مگر شانِ امارت میں کوئی کمی نہ تھی۔ سیٹھ ہارون یعقوب کا تمدن بھی کچھ اسی قسم کا تھا، مثلاً یہ کہ اُردو ان کی مادری زبان تھی لیکن اردو میں ان کا ہر جملہ "اجُون" سے شروع ہوتا اور "آئے لا ہے، جائے لا ہے، کھائے لا ہے۔" پر ختم ہوتا۔

سیٹھ صاحب کے فلیٹ سے نیچے جو سیڑھیاں اترتی تھیں، وہ اس مکان کو دیکھتے ہوئے بڑی گندی سی تھیں۔ یہ یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا کہ جو بلڈنگ باہر سے اتنی شاندار ہے اس کی سیڑھیاں اندر سے اتنی گندی ہوں گی۔ یا جس مکان کی سیڑھیاں اتنی گندی ہیں اس میں سیٹھ صاحب کا فلیٹ اندر سے اتنے شاندار سامان سے آراستہ کھلے گا......

ان گندی سیڑھیوں پر ایک کلرک، بالکل کھدر پوش، ایک اور کلرک کی اُجلی اُجلی کھدر پوش بیوی سے باتیں کر رہا تھا ــــــ ذرا لگاوٹ کی۔

پونے آٹھ کے قریب سی سی آئی پہنچا۔ خواجہ انور جو "کشمیر کے قالینوں کے بادشاہ" خورشید مقدس جی سے باتیں کر رہے تھے۔ جس میز پر وہ بیٹھے ہوئے تھے اس کے قریب سے ایک اور جوڑا گذرا اور انور جو نے مجھ سے ان کا تعارف کرایا۔ رحیم بھائی یہ پہلوان قسم کے بوہرے تھے، مسز زرنگار رحیم بھائی یہ ان کی ذرا بھونڈی سی شکل کی

بی بی جی تھیں، اور پھر وہ دونوں آگے بڑھ گئے۔ آج شام کو سی سی آئی میں کتنی بہت سی عورتیں تھیں، زیادہ تر ڈھیلی، زیادہ تر پیلی پیلی، زیادہ تر بدشکل۔ چھ قابلِ برداشت لڑکیاں سُرخ سُرخ ہونٹوں میں سفید سفید دانت چمکاتی ایک ہی میز کے اطراف بیٹھی تھیں ایک میز اور چھ لڑکیاں حسن اور اس قدر افراط سے اس شام کو ضائع ہو رہا تھا۔

طے یہ ہُوا کہ ہم تینوں یعنی میں، انور جو، اور خورشید مقدس جی تاج محل میں کھانا کھائیں خورشید مقدس جی کے پاس کیا اچھی کیڈلک ہے، اور ان کی کیڈلک میں سوار ہوتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ یا تو میں احساسِ کمتری کا شکار ہوں، یا خورشید مقدس جی کو کچھ تو احساسِ برتری ہے، اور وہ ہم لوگوں کو جو ان کے اتنے نودولتے اور ان کے برابر امیر نہیں حشرات الارض سے کچھ ہی برتر سمجھتے ہیں۔ تاج محل میں کچھ دیر اُوپر برآمدے میں بیٹھ کے دیسی وہسکی پیتے رہے، اور سمندر کی ہوا کھاتے رہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد سرپرستی کے انداز میں خورشید مقدس جی انور جو سے پوچھتے۔ "پھر کیا ہُوا انور اعظم" پھر کیا ہُوا انور دی گریٹ۔" خورشید مقدس جی دراصل انور جو کے والد کے دوست تھے۔ وہ ان کی سرپرستی مسکرا کے اور بڑی معصومیت سے شانے ہلا کے سہہ لیتا۔

کھانا ایسا بُرا نہیں تھا۔ تاج محل ہوٹل اچھے کھانے کے معاملے میں اس قدر بدنام ہے۔ خورشید مقدس جی نے کانٹا سنبھال کے پلیٹ پر رکھا اور عینک سیدھی کی۔ میں نے ان کی عینک کی سیدھ میں تفتیش کی، تو ان کی طرح میری بھی نظر اسی پر رکی۔ وہی سانولی سلونی خاتون جو آج سہ پہر کو راجہ باجپائی سے ملنے آئی تھی۔ دراز قد اس کے

چہرے کا شکن در شکن نمک، اب مسیح ہو چکا تھا، جیسے سمندر سے موجیں مفقود ہو جائیں۔ اس کے ساتھ کوئی اور تھا، ایک امریکن افسر۔ یقیناً اس میں بڑی دلکشی تھی، گجراتی عورتیں عموماً دلکش ہوتی ہیں مگر اُن سب کی ملکہ معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اپنی جانب دیکھتا دیکھ کر وہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ مسکرائی، اور خورشید مقدس جی کی عینکوں کی طاقتور دوربین خوردبین بن کر میرا جائزہ لینے لگی۔ "آپ اسے جانتے ہیں؟"

"ہاں بہت معمولی طور پر۔ ایک آدھ مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔"

"کون ہے......؟" خورشید مقدس جی نے بیتابی سے پوچھا۔

خورشید مقدس جی جواب کا انتظار کرتے رہے۔ مجھے اب اپنے احساسِ کمتری، ان کے احساسِ برتری کا بدلہ لینا تھا۔ میں انور جو سے کشمیر کے حالات پوچھنے لگا۔

کھانے کے بعد خورشید مقدس جی نے کہا کہ معشوقہ کا ہمیشہ اعلےٰ "طبقے" سے تعلق ہونا چاہیئے۔ جب تک اچھے طبقے کی لڑکی نہ ہو عشق بازی میں کوئی لطف نہیں اور اچھے طبقے کی لڑکیاں وہی ہیں جو کلبوں، خصوصاً ولنگڈن کلب میں خورشید مقدس جی کو ملتی ہیں۔

آہستہ آہستہ لی کر کو چکھتے ہوئے خورشید مقدس جی نے کہا۔ "اس معاملے میں کوئی شہر بمبئی کی برابری نہیں کر سکتا۔" اور پھر گلاس آہستہ سے میز پر رکھ کے انور جو کو مخاطب کر کے، اور میری ہستی کو قریب قریب فراموش کر کے انہوں نے کہا۔ "اب تو جنگ کی وجہ سے عاشقی بھی قریب قریب محال ہو گئی ہے۔ ورنہ میں نے میرین ڈرائیو میں

ایک فلیٹ لے رکھا تھا۔ گھر پر لڑکیوں کو بلواؤں تو جوتے پڑیں گے۔ اس کے علاوہ اب میری لڑکی کی عمر اٹھارہ سال کی ہو رہی ہے۔ خیر تو وہ میرین ڈرائیو کا فلیٹ زبردستی لے لیا گیا۔ اب اس میں رائل نیوی کے دو افسر ہیں۔ شہدے، خوب ٹھاٹھ کرتے ہوں گے۔"

اس زمانے میں ۵۵۵ سگریٹ بالکل عنقا تھے۔ خورشید جی نے اپنی جیب سے چاندی کا سگریٹ کیس نکالا جس پہ زمانۂ ماقبل جنگ کی مملکتِ آسٹریا کا نقشہ تھا۔ اور اُس میں ۵۵۵ بھرے ہوئے تھے۔ بے نیازی سے اُنھوں نے سگریٹ میری طرف بڑھائے۔ پھر اس کا انتظار کرنے لگے کہ اُنور جوان کا سگریٹ جلائے اور پھر ایک کش لے کر انھوں نے کہا۔ "بمبئی کی بات ہندوستان کے کسی شہر میں نہیں آتی۔"

میں نے محض مخالفت کرنے کے لئے کہا۔ "سیٹھ صاحب ہم تو لاہور کے قائل ہیں۔ دیکھئے نا گذشتہ جنگ کے بعد یورپ میں ایک نئی طرح کی لڑکی وجود میں آئی، جو بڑے ہلکے پھلکے کپڑے پہنتی تھی، اور مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں حصّہ لیتی تھی۔ اب تو وہ اور بھی زیادہ سادہ اور مرد کی ہم جولی سی ہو گئی ہے۔ سلیک پہنتی ہے، کوٹ پہنتی ہے۔ کبھی کبھی ٹائی بھی لگاتی ہے۔ سائیکلوں پہ چڑھی چڑھی پھرتی ہے۔ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے موٹر چلاتی ہے۔ اسی نئی طرح کی لڑکی کو فلیپر کہتے ہیں۔ ہندوستان کے کسی اور شہر میں اب تک فلیپر نے نشو و نما نہیں پائی۔ مگر لاہور کی لڑکی فلیپر بن چکی ہے۔ فراک نما قمیص اور سفید شلوار پہنے، دوپٹے کو آرائش کے لئے گلے میں ڈالے وہ مال پر، انار کلی میں، لارنس گارڈن میں کھٹ کھٹ کرتی

پھرتی ہے۔ اس میں کوئی جھوٹی زنانہ نزاکت نہیں۔ وہ ٹینس کھیلتی ہے، اسکواش کھیلتی ہے سیکلوں پہ ماری ماری پھرتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہ اُسے ذرا آزادی بھی حاصل ہے یہ بات بمبئی میں ....“

”اجی کیا باتیں کرتے ہو“ عرب ڈاربی کے جیتنے والے بوہرہ تاجر خورشید مقدس جی نے میز پہ گھونسہ مار کے بات کاٹتے ہوئے بے صبری سے کہا ”لاہور۔ لاہور کیا۔ ہم بھی لاہور دیکھ آئے ہیں۔ لاہور میں کیا ہے“

انور جو نے بڑی معصومیت سے شانے ہلائے۔ وہ بھی شاید کسی زمانے میں لاہور کے حسن کا زخم خوردہ رہ چکا تھا اور کہا ”نہیں سیٹھ صاحب اس معاملے میں تو ہم بھی لاہور کے قائل ہیں“

سیٹھ صاحب نے بالآخر اس بحث کو رفع دفع کر دینے کے لئے کہا ”خیر ہوگا، اپنا اپنا تجربہ ہے۔ مگر ہم کو تو بمبئی کی لڑکیوں کے برابر کہیں کی لڑکیاں پسند نہیں اور بھئی بمبئی میں میں نے جتنا مزا اڑایا ہے اتنا تم دونوں نے مل کے لاہور میں نہ اُڑایا ہوگا۔ اور تو اور میں تو یورپ بھی ہو آیا ہوں۔ آسٹریا میں وی آنا گیا تھا۔ وہاں کی لڑکیاں اہاہاہا۔ وی آنا کے قریب ایک فیکٹری ہے۔ وہاں کی مزدور لڑکیاں سولہ سولہ سترہ سال کی، سنتروں کی جیسی — سب دیکھا ہے لیکن بمبئی کی بات کسی شہر میں نہیں آتی۔ کیونکہ یہاں تو اچھے طبقے کی لڑکیاں نہیں ملتیں۔ اور جب تک لڑکیوں کا ”طبقہ“ اچھا نہ ہو بھلا عاشقی میں کیا لطف“

بیکار دن بیکار راتیں

رات زیادہ ہو رہی تھی، اور قریب کے میزوں سے یکے بعد دیگرے بہت سے جوڑے اُٹھ چکے تھے۔ خورشید مقدس جی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ایکٹرسیں مجھے اسی لئے سخت ناپسند ہیں۔ سب روپیہ کے درپے ہوتی ہیں۔ اُن میں وہ 'طبقہ' کی خوبی نہیں ہوتی۔ ضرورت اس کی ہے کہ محبوبہ ہمیشہ اعلیٰ طبقے کی ہو۔ مگر اس کے لئے بہت روپیے کی ضرورت ہے۔"

میں صرف جاسوسی ناول پڑھتا ہوں۔ میرے پاس جاسوسی ناولوں کا ذخیرہ ختم ہوگیا ہے۔ اس لئے میں پہلے تو فورٹ کی کتابوں کی دوکانوں کا چکر لگاتا ہوں، پھر اسٹیشن جاتا ہوں جہاں وہیلر کے بک اسٹال پہ مزے مزے کے جاسوسی ناول اکثر مل جاتے ہیں۔ اسٹیشن پہ دو سانولی سی اینگلو انڈین لڑکیاں میرے قریب سے ہو کر گذرتی ہیں، اور میری طرف دیکھتی تک نہیں، کاش ان دونوں میں سے کوئی ایک میری ہو سکتی۔ ایک پستہ قد، موٹی سی عورت مرچ کے رنگ کی ساڑی پہنے، ہونٹوں پہ گہری موٹی سرخی لگائے اپنا بیگ گھماتی ہوئی کسی کا انتظار کر رہی ہے، اور بار بار گھڑی دیکھتی ہے۔ میں اس کی طرف گھور کے دیکھتا ہوں، اس کے دانت نظر آرہے ہیں، اور اس کے لبوں پر جو مسکراہٹ ہے وہ شرمیلی سی ہے، سرد ہے، اور کسی قسم کا وعدہ نہیں کرتی۔

شام کو میں دادر جانے کے ارادے سے نکلتا ہوں۔ بس کے انتظار میں کھڑا ہوں

اوپر جو نظر اٹھا کے دیکھتا ہوں تو جھروکوں، اور چبوتروں سے راجہ باجپائے کے تمام نوکر کھڑے ادھر ہی ادھر دیکھ رہے ہیں، بوائے، بٹلر، باورچی۔ بس جہاں ٹھہرتی ہے وہاں اسکول جانے والی مرہٹہ لڑکیوں کا ایک بڑا ہجوم ہے، صحت مند، جوان، سانولی جل پریوں کا ایک طوفان سا ہے جو امنڈ رہا ہے۔ اتنی سب یہاں کیسے آگئیں اور بس میں ان کو جگہ کیسے ملے گی۔ اچھا یہ برلا ہاؤس میں گاندھی جی کے درشن کرنے آئی ہوں گی۔ راجہ باجپائے کے نوکر مجھے ان لڑکیوں کی طرف گھورتا دیکھ کر مسکرا رہے ہیں اور میں ان لڑکیوں کی طرف سے منھ موڑ کے کھڑا ہو جاتا ہوں، اور سمندر کے جھاگ کے کنارے امنڈتے ہوئے کووں کو دیکھتا ہوں۔

بس آتی ہے، اور سرکس کی بازیگروں کی طرح اسکول کی لڑکیوں کا یہ امنڈتا ہوا سیلاب بس کی اوپر کی منزل پر چڑھ جاتا ہے، اوپر کی منزل کھلی ہوئی ہے، چھت غائب ہے، اور ہلکی ہلکی خوشگوار دھوپ بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ میں بھی انہیں لڑکیوں کے ریلے میں بس کی اوپر کی منزل تک پہنچ جاتا ہوں، اور بیٹھنے کے لئے جگہ ڈھونڈھ رہا ہوں، ادھر دیکھتا ہوں تو اُدھر راجہ باجپائے کے نوکر ابھی تک میری طرف دیکھ کے مسکرا رہے ہیں، دوسری طرف گردن پھیرتا ہوں تو کوئی میرا نام لے کر پکارتا ہے، اور اس ہجوم میں کوئی میری آستین پکڑ کے اپنے پاس بٹھا لیتا ہے۔ یہ میجر نذیر ہے۔ اس کی آنکھیں شرارت سے چمک رہی ہیں۔

ایک عورت جو ان لڑکیوں کی بڑی استانی ہے، بار بار ان سے مرہٹی میں کچھ

نہ کچھ کہہ رہی ہے، ایک ادھیڑ عمر کا مرد جو بڑی اُجلی دھوتی، اور سفید کھدر کا کرتا پہنے ہے اس کا بھی ان لڑکیوں اور ان کے مدرسے سے ضرور کچھ نہ کچھ تعلق ہے، بڑی استانی کو رجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔

نذیر شرارت سے مسکرانے لگتا ہے اور پوچھتا ہے "کدھر کا ارادہ ہے؟"

"دادر کا!"

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی۔ سنا ہے وہاں کوئی ریستوراں ہے جہاں تمام فلم اسٹار جمع ہوتے ہیں۔ اس ریستوراں کو ڈھونڈھنے جا رہا ہوں۔"

"کیا وقت خراب کر رہے ہو۔ اجی جتنی ایکٹرسوں سے ملنا چاہو۔ راجہ باجپائی سے کہو وہ تمہیں ملا دے گا۔"

"نہیں۔ اس خیال سے نہیں۔ یوں ہی ذرا ان کی زندگی دیکھنے جا رہا ہوں۔"

نذیر نے کہا۔ "اچھا زندگی دیکھنے کا شوق کب سے شروع ہوا؟"

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟"

"سینما"

"ہرگز نہیں۔"

"اچھا ہار بر بار جا رہا ہوں۔ بس۔"

میں چرنی روڈ پہ اتر جاتا ہوں۔ اسٹیشن کا پلیٹ فارم بہت غلیظ ہے، اور چھوٹے

چھوٹے اسٹیشنوں کے سوا ہندوستان میں اسٹیشنوں کے پلیٹ فارم، کہاں غلیظ نہیں ہوتے ایک عجب طرح کی مرکب بدبو مسافروں کے ہجوم، فرش اور دیوار و در سے آرہی ہے۔ مکھیوں کے ہجوم ہر چکنائی کے دھبّے پر بھنبھنا رہے ہیں۔ اور اتنے میں بی بی اینڈ سی آئی کی کھڑکھڑاتی ہوئی لوکل بھی آہی جاتی ہے۔

اِس لوکل ٹرین میں سیکنڈ کلاس کا ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہے۔ مگر ایک مسلمان تاجر سیاہ فراک کوٹ پہنے، زری کی دستار سی باندھے، تن و توش ضرورت سے بہت زیادہ فربہ داڑھی گالوں پر چھدری چھدری مگر ٹھوڑی کے نیچے کافی بڑی، ٹائمز آف انڈیا ہاتھ میں دبوچے، کھڑے ہوئے مسافروں کے زمرے سے نکل کے ایک سیٹ کی طرف بڑھتا ہے اور گھس کے بیٹھ جاتا ہے! جو مسافر اس بنچ پر پہلے سے بیٹھے تھے جن میں ویک آئی کی ایک ادھیڑ افسر بھی تھی، اس کی طرف گھور کے دیکھتے ہیں، مگر سب اس کی اس کامل با اطمینان بدتمیزی سے مرعوب ہیں۔

دادر غلیظ مقام ہے۔ آج اسٹیشن سے ذرا آگے ہی سڑکوں کی روشوں پر میلہ لگا تھا۔ مرہٹنیں جن کے رنگ ہلکے زیتونی سے لیکر گہرے سرمئی تک مختلف انواع کے تھے مگر سب کے سب نمکین، دھوتیاں پہنے ترکاری بیچنے والوں، کنجڑوں اور خوانچہ فروشوں سے سودا چکا رہی تھیں۔ ہر جگہ مرہٹی بولی جاتی تھی اور سیواجی پارک قریب تھا میں میلے کا تماشا دیکھتا ہوا سیواجی پارک کی طرف ہولیا۔ جہاں وہی سبز رنگ کا ریسٹوراں ہے۔ راستہ میں کئی لوگوں سے پتہ پوچھا۔ ایک صاحب پتلون پر نیم آستین قمیص

پہنے چلے جا رہے تھے۔ کہنے لگے۔ "نہ میں کبھی ہندوستانی فلم دیکھتا ہوں نہ ہندوستانی فلمی ستاروں کے نام مجھے معلوم ہیں۔ نہ میں اس سبز ریستوراں سے واقف ہوں جہاں یہ سب جمع ہوتے ہیں۔ میں انشورنس ایجنٹ ہوں۔ اگر جیب میں کچھ ٹکے ہوں تو اپنی زندگی کا بیمہ کرا لیجیے۔"

ایک جگہ موڑ پر ایک پان سگریٹ کی دوکان نظر آئی اور پان سگریٹ لینے میں ٹھہر گیا۔ پان والے سے میں نے پوچھا۔ "بھیّا یہاں کوئی ایسا ریستوراں ہے جس کے دروازے اور دیواریں ہری ہیں، اور جہاں فلموں میں کام کرنے والے لوگ آتے ہیں۔"

پان بیچنے والے لٹھ مار الہ آبادی بھیّا نے کہا۔ "ہاں جی۔ اُدھر سامنے کی طرف چلے جاؤ۔ وہ کیا ایرانی ہوٹل ہے۔ بس وہیں یہ سنیما والے جمع ہوتے ہیں۔"

اور فی الحقیقت بالکل قریب وہی ایرانی ریستوراں تھا۔ بظاہر اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی، بالکل ایسا ہی تھا جیسے بمبئی کے اور ہزاروں ایرانی ریستوراں۔ دیواروں پر آئینے اور آئینوں کے حاشیوں پر موٹے رنگ کے دھبوں سے نقش و نگار۔ میزوں کے اطراف چھوٹی چھوٹی کرسیاں۔ میزوں کے تختے سنگِ مرمر کے، اور ان پر ہزاروں مکھیاں۔ وہی کھانا کھلانے والے چھوکرے، دو ہاتھوں پر تین تین چار چار رکابیاں سنبھالے ہوئے، ان چھوکروں کے ہاتھوں میں میلے کپڑے جن سے وہ ہر نئے گاہک کے آنے پر میز کا سنگِ مرمر صاف کرتے ہیں۔ وہی ٹماٹو کی چٹنی اور سیاہ مرچ اور نمک۔

یہ شام کا وقت تھا، اور گاہک قریب قریب مفقود تھے۔ ہوٹل کا منیجر بڑے اطمینان اور غرور سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے "سالا چھوکرا لوگ" پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اس کا

سفید ڈوک کا پتلون بالکل شفاف تھا۔ اور سفید قمیص صرف گردن کے قریب پسینے کی وجہ سے ذرا ملگجی ہوگئی تھی۔ منیجر کے قریب کیپ سٹن سگریٹوں کا ڈبہ ہاتھ میں لئے ایک اور نوجوان بیٹھا تھا جس کے آگے بہت سے اخبارات پڑے ہوئے تھے۔ میں سوچنے لگا یہ صاحب فلم اسٹار تو نہیں؟ اخباروں سے یہ صاحب غالباً بہت دیر پہلے فارغ ہو چکے تھے اور اب یکے بعد دیگرے کیپ سٹن کے ڈبے سے سگریٹیں نکالنے اور ان کو دھواں بنا کر اڑانے میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک آدھ منٹ کے لئے کوئی اخبار اٹھا لیتے اور اسے پھر اپنی جگہ رکھ دیتے۔ اور کبھی کبھی منیجر صاحب سے ایک آدھ بات کر لیتے۔ مگر وہ اور منیجر صاحب دونوں خوشگوار خاموشی کا لطف اٹھا رہے تھے ایک مکعب گوشے میں، یعنی لکڑی کے کابک میں ایک جوڑے کے ہنسنے اور بات کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے کہا یہ ضرور فلم اسٹار ہوں گے، اور یہ کیپ سٹن اور اخبار والا تو فلم اسٹار تو کیا، فلموں کے منشی یا مصنف قسم کا کوئی انسان ہوگا اور میں غور سے پھر اس جوڑے کی ہنسی اور باتوں کی آواز سننے لگا جو اس لکڑی کے ڈبے میں چوں چوں کر رہا تھا۔ محض ان دونوں کی صورت دیکھنے کے لئے میں نے چائے کی ایک پیالی اور دو سڑی گلی پیسٹریاں ختم کرنے میں آدھا گھنٹہ لگا دیا۔ منیجر نے میری طرف ایک نظرِ خوش گذرے ڈالی اور پھر مجھ نووارد کو بالکل بے ضرر، بے خطر سمجھ کے اپنے ساتھی نوجوان سے باتیں کرنے لگا۔

اور اتنے میں وہ لکڑی کی کابک والا جوڑا باہر نکلا۔ مرد ڈوک کے پتلون اور جالی دار

رنگین بش شرٹ ہیں، اور عورت چہرے پر، ناخونوں پر، ہونٹوں پہ سرخی جمائے، گندمی رنگ مگر جوان اور اچھی خاصی قبول صورت۔ منیجر کی طرف دیکھ کے وہ مسکرائی، اور منیجر نے اس کی مسکراہٹ کا اس طرح جواب دیا کہ گویا وہ اس سے بہت زمانے سے، بہت اچھی طرح واقف ہے مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں ......

میں سوچنے لگا معلوم نہیں یہ لڑکی فلم اسٹار ہے، فلم اسٹار بننے والی ہے۔ یا اکسٹرا ہے۔ اس کے ساتھ جو سرطان صورت آدمی ہے وہ تو کوئی اعلیٰ فلم اسٹار نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے تصویر کش ہو، مصنّف ہو۔ بھئی یہ اتنی دور کا سفر بیکار رہی ہوا۔ ایک فلم اسٹار بھی نظر نہ آیا ......

باہر نکل کے میں پھر پان والے بھیّا کی دوکان پر پہنچا۔ اس نے ایک پان بنا کے میرے حوالے کیا۔ میں نے کہا۔ بھیّا وہاں فلم اسٹار تو فلم اسٹار فلم کے چوہے بھی نہیں۔ بھیا کہنے لگا کہ نہیں۔ موتی لال اور چودھری اکثر وہاں آتے ہیں۔ قریب قریب روز۔ اور اتنے میں سامنے ہی ایک بڑی سی موٹر ٹھہری، اس میں سے ایک صاحب گلابی رنگ کا زرق برق بش شرٹ پہنے اترے۔ پان والے نے کہا۔ دیکھو چودھری یہی ہیں۔

میں جلدی سے آگے بڑھا اور چودھری صاحب نے سر سے پاؤں تک مجھے ذرا چڑ کے استفہامیہ نظر سے دیکھا مگر جب میں نے اپنا تعارف کرایا، اور یہ بتایا کہ میں مالابار ہل پہ راجہ باجپائے کا مہمان ہوں تو بڑی مشکل سے صبر کر کے انہوں نے کہا۔ "بڑی خوشی ہوئی ارشاد" چودھری صاحب کے دانت پان کی شدت سے بہت میلے ہو رہے تھے۔ بہر حال انہوں نے بڑی نوازش کی اور فرمایا۔ ہر روز وہ

صبح و شام اس ریستوراں کو آتے ہیں اور مجھے دعوت دی کہ میں یہیں آکے ان سے ملوں۔ میں نے اپنا ٹیلیفون نمبر بتانا چاہا تو انھوں نے کہا۔ "اجی نہیں صاحب یہاں کسے اتنی فرصت ہے کہ آپ کو ٹیلیفون کرتا پھرے۔ آنا ہو آجایئے ورنہ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کے انھوں نے سر پہ ہاتھ رکھا اور ریستوراں کے اندر جا پہنچے، جہاں کا منیجر میری طرف ناپسندیدگی اور غور سے دیکھ رہا تھا۔

بس فلم کے ستاروں کے درشن کی حد تک اس روز مجھے صرف اسی قدر کامیابی ہوئی۔ لیکن اسی طرح میں ان کی زندگی دیکھنا چاہتا تھا۔ بھلا اس میں کیا لطف کہ ایک پارٹی دے کے راجہ باجپائے آسمانِ سیمیں کے دو درجن ستاروں کو بلا بھیجیں۔ پھر ایک گندی سی بس میں، جس میں گنجائش سے زیادہ بھیڑ میں بوری بندر پہنچا، اور وہاں سے میرین ڈرائیو جانے کے لئے وکٹوریا لی۔ شام کے وقت بمبئی کی سڑکوں پہ وکٹوریا میں سفر ایک خاص کیفیت رکھتا ہے۔ دورویہ کئی کئی منزلوں کے درمیان، شام کی عملک فضا میں، اور بہت سے جانداروں، کئی طرح کی مرکب حرکت کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنے مقید اور مجبور رہنے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور یہ اس وقت تک باقی رہتا ہے، جب تک چرچ گیٹ کے قریب سمندر کی پہلی جھلک نظر نہیں آجاتی۔ لیکن سمندر پر نظر پڑتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دورویہ عمارتیں انسان کو قید نہیں کر سکتیں، نہ بے کیف شام اسے اسیر کر سکتی ہے، اس میں تفریح اور آزادی کی اتنی ہی وسعت ہے، جتنی بے کنار سمندر میں۔

وکٹوریہ والے کو پیسے دے کے میں اترا ہی تھا کہ راجہ ہریش چندر نظر آئے۔ یہ راجہ باجپائے کے رشتے کے بھائی ہیں، عمر میں ان کے آدھے ہیں۔ اور ابھی ابھی انکی شادی ہوئی ہے، ان کی رانی بھی ساتھ تھیں،

اُن کی رانی کا چاکلیٹ کا سا رنگ تھا، سر کے بال چکنے اور بنے ہوئے، اور ہونٹ پتلے اور دونوں سروں پر ایک قدرتی طنز کے انداز میں جھکے ہوئے۔ بچاری بہت دبلی پتلی تھیں، اور سینہ اس عنفوانِ شباب کے عالم میں اندر کی طرف دھنسا ہوا۔

"ارے تم......؟"

رانی نے اپنے پتلے طنزیہ لبوں سے متبسم ہو کے، ہاتھ جوڑ کے نمستے کہا۔ راجہ ہریش چندر پر تنی ہوئی شیروانی بہت زیب دے رہی تھی، اور میرین ڈرائیو کی روش پر سے گذرنے والی گجراتی لڑکیوں کی آنکھیں کبھی کبھی لمحے بھر کے لئے ان کی شیروانی سے اٹک جاتیں، پھر ان کے چہرے کی طرف ایک لحظہ کے لئے اٹھتیں، پھر سر سے قدم تک ان کا جائزہ لے کے دوسرے لمحے انہیں بھول کے اپنا راستہ لیتیں۔

پیرسٹین ڈائری میں ٹھنڈی کافی پی کے اِدھر اُدھر کی مہمل چیزوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ رانی صاحبہ بھی کبھی کبھی کچھ کہتیں، ہنستیں، پھر سمندر کی طرف دیکھ کے سوچ میں کھو جاتیں، اور ان کے ماتھے کی بندی مدھم پڑ جاتی۔

ریس کورس پر حُسن ہی حسن۔ ہوا میں اڑتے ہوئے ساڑھی کے پلوؤں میں حُسن، سر سے

ڈھلکتے ہوئے آنچلوں میں حسن، سڈول جسموں کے اطراف لپٹی ہوئی ساڑیوں کی شکنوں میں حسن۔ رنگوں میں حسن، چہروں میں حسن، کٹی ہوئی لہراتی ہوئی زلفوں میں حسن، نیلی، شربتی کالی آنکھوں میں حسن، چمکتے ہموار دانتوں میں حسن، ہاتھوں کے ہلانے، زبان کے ہلانے میں ہونٹوں کی جنبش، قدموں کی رفتار میں حسن۔ میں گھوڑ دوڑ کیا خاک دیکھوں۔

راجہ صاحب ہزاروں کی شرطیں کھیل رہے ہیں۔ کبھی کبھی میرے جیب سے بٹوہ نکال کے اس میں سے روپے نکال کے لے جاتے ہیں، اور پھر کچھ زیادہ روپیہ لا کے مجھے دے دیتے ہیں۔ بھئی میزبان ہو تو راجہ باجپائے کا سا ہو۔ ہر چیز کی، ہر بات کی فکر۔ راجہ باجپائے گھوڑ دوڑ میں مجھے ڈھونڈھ نکالیں۔ مگر میں ان کو نہیں ڈھونڈھ سکتا۔ فیشن ایبل انسانوں کے اس ہجوم میں وہ پارہ ہیں، سیماب ہیں۔ ابھی یہاں، ابھی وہاں ان کا ڈھونڈھنا ناممکن ہے۔ نذیر کہہ رہا ہے۔ وہ کیا راجہ صاحب کھڑے اس سینما ایکٹرس سے باتیں کر رہے ہیں۔ اور ایکٹرس سر سے بار بار ساڑی کا آنچل گرا کے ہنس ہنس کے بجلیاں گرا رہی ہے۔ جوان ہے، شاداب ہے، اس کا جسم ذرا بھاری ہے، اور جب ہنستی ہے تو اس کی بوٹی بوٹی پڑی تھرکتی ہے۔ ادھر ایک لکھنوی جوان بڑے ہی بڑھیا سوٹ میں کچھ دور کھڑا اپنے ساتھی سے کہہ رہا ہے۔ "دیکھ رہے ہو سار ڈالا ظالم نے۔ ہائے ماتھے پہ بندی، بوٹا سا قد۔"

ایرانی لڑکیوں کی فصل کی فصل کھڑی ادھر دیکھ رہی ہے، جہاں گھوڑے پھرائے جا رہے ہیں۔ ادھر ابھی ابھی ہمارا راجہ برادران ڈیڑھ میل والی دوڑ جیت چکے ہیں۔ ان

ایرانی لڑکیوں کے ساتھ سب سے زیادہ سیاہ پوش ایک معمر خاتون ہے۔ اس کی بے عیب فارسی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر اس کی انگریزی بھی بے عیب ہے۔ اُس سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ کہ کس گھوڑے پر شرط لگائی جائے یہ مجھے کیا معلوم البتہ راجہ باجپائے نے میری کتاب پر کچھ نشانات بنا دیئے۔ معمر ایرانی خاتون ان نشانات کو نقل کر لیتی ہے۔ اور پھر اپنی ساتھ والی ایک لڑکی سے کچھ کہتی ہے۔ یہ لڑکی بھی سیاہ پوش ہے، مگر اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک غمی کی نہیں اس میں رس ہی رس کشش ہی کشش ہے۔ اس لڑکی کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں شادی کی انگوٹھی ہے۔ قبضے کی مہر۔ پھر بھی اس کی آنکھیں کسی کی ملکیت نہیں بن سکتیں، ان میں شیراز کی شراب ہے۔ جو جام سے چھلکی جاتی ہے، اُن میں آبِ رکنا باد کی، زندہ رُود کی شفاف چمک ہے میری ٹوٹی پھوٹی فارسی پر وہ شائستگی سے مسکراتی ہے اور پھر ہمت افزائی کے لئے فارسی ہی میں جواب دیتی ہے۔ جملے میں دو ایک لفظ میری سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اور پھر معمر خاتون اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتی ہے۔ معمر خاتون کا شوہر تیس سال تک بمبئی میں درآمد برآمد کا کاروبار کر کے خدا کے پاس جا پہنچا۔ اسی لئے یہ ایرانی خاندان سیاہ پوش تھا۔ لیکن بھلا کہیں گھوڑ دوڑ سے مفر ممکن ہے۔ اسی جمگھٹے میں ایک اور زیادہ کمسن لڑکی ہے جس کی آنکھیں غزالی ہیں۔ بالکل ہرنوں کی سی آنکھیں، مگر اس کی ٹھوڑی بھی غزالوں کی سی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے خوبصورت قرار دوں یا بدشکل۔

ایک پارسی لڑکی آکے ان سب سے باتیں کرنے لگی۔ اس کا قد بلند اور نازک تھا

وہ ہری ساڑی پہنے تھی اور بڑی حسین معلوم ہوتی تھی۔ ایک سنہرے بالوں والی ہندو لڑکی قریب سے ہو کر نکلی، جس کے چہرے پر غازے یا سُرخی کا خفیف سا دھبّہ بھی نہ تھا، اور اسی لئے اس کے چہرے سے بڑی غیر معمولی قدرتی ملاحت ٹپکتی تھی۔

میں نے خورشید مقدس جی کی دعوت پر ان کے ساتھ چائے پی۔ انگریزی میں وہ سیٹھ ہارون یعقوب سے کہہ رہے تھے: "اجی سرائیوب خاں کی اندھیری والی کوٹھی میں ایک پارٹی کا انتظام کیوں نہ کریں۔ مگر ذرا بے تکلف لوگوں کو بلائیں گے۔ راجہ باجپائے کو بلائیں گے اور اپنے اِن حیدرآبادی دوست کو۔۔۔۔۔۔" اور یہ کہہ کے بڑی سرپرستی کے انداز میں انہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اور انور جو کو، نواب اور بیگم مہتاب جنگ کو۔۔۔۔ اب مہتاب جنگ کیسے ہیں؟"

"اب تو اچھے ہیں۔" سیٹھ صاحب نے انگریزی ہی میں جواب دیا۔

"اس میں موتی لال کو بھی بلا ہی لیں گے۔ بیگم پارہ اور پرویتما داس گپتا کو بھی بلا لو۔ ہارون تم کو معلوم ہے میں سنیما کی ایکٹرسوں سے نہیں ملتا۔ مگر یہ لڑکیاں اچھے طبقے کی ہیں۔ لیکن ممتاز جہاں کو نہیں بلائیں گے۔ وہ سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ میں نے مانا، مگر لڑکی کم سے کم متوسط طبقے کی تو ہو۔ بڑی مشکل یہ ہے کہ میرا اسٹیوارڈ چلا گیا ہے، اس کی وجہ سے تمام بٹلر بے قابو ہو رہے ہیں۔ نوکروں میں کوئی انتظام باقی نہیں رہا۔ سب سے زیادہ ضرورت تو ایک اسٹیوارڈ کی ہے۔۔۔۔" اور مجھ سے مخاطب ہو کے خورشید مقدس جی نے پھر اسی سرپرستی کے انداز میں کہا۔ "مہاراجہ کارومنڈل کو میں نے آج

بے تکلفی سے کاک ٹیل پینے کے لئے ولنگڈن بلایا ہے۔ تم بھی آجاؤ نا، بلکہ یہیں سے میرے ساتھ چلے چلو۔"

چائے پی چکنے کے بعد میں اِدھر اُدھر پھر کے دیکھنے لگا۔ ایک پنجابی لڑکی بھاری بھرا ہوا جسم، موٹے دعوت دیتے ہوئے سرخ سرخ ہونٹ، ایک بڑے کم رو نیاز مند سے شوہر کے ساتھ ساتھ تیز تیز چلی جا رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف گھور کے دیکھا تو بُرا مانے بغیر سوالیہ انداز میں اس کی آنکھوں نے پوچھا "کیوں۔ کیا اس سے پہلے آپ سے ملاقات کا شرف کبھی حاصل ہوا ہے؟"

نواب علی امداد خاں بھی تھے۔ گھوڑ دوڑ اور شرطوں میں بہت منہمک۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کی نوجوان بیگم صاحبہ۔ تر و تازہ چہرے اور سرخ ہونٹوں میں چمکتے ہوئے سفید دانت مسکراہٹ مگر وہ دوسری خواتین کے ہجوم ہی میں زیادہ تر شامل رہتیں۔ نواب امداد علی خاں البتہ بڑے اہتمام سے ہر دوڑ میں ہر گھوڑے کی خصوصیات، اس کے جاکی کے ماضی اور حال کے کارناموں، ہر گھوڑے کے وزن، اس کی تربیت کرنے والے کے ہنر، اُس گھوڑے کے مالک کے اصطبل اور ایسی بہت سی تفصیلوں کو اچھی طرح جانچنے کے بعد گھوڑے کا انتخاب کرتے، کبھی "ون نہ کھیلتے، ہمیشہ پلیس" کھیلتے اور اسی پر بھی کبھی سو روپیہ سے زیادہ کی شرط نہ لگاتے۔ اور اس طرح قریب قریب ہر دوڑ میں جیتتے۔ تھوڑا ہی جیتتے مگر ضرور جیتتے۔ یہ سبق انہوں نے بہت کھو کے سیکھا تھا۔ اور اب اپنے اصطبل کو وہ بڑے سائنسی انداز سے چلا اور بڑھا رہے تھے۔

اس شام کو میں خورشید مقدس جی اور انور جُو کے ساتھ ولنگڈن میں بیٹھا وہسکی پی رہا تھا اور ثقیل ثقیل سنبوسے کھا رہا تھا۔ باہر میزوں کے اطراف ہلکا سا اندھیرا تھا، اور اندر آرکسٹرا ناچ کی موسیقی بجا رہا تھا، اور اندر زرق برق ساڑیوں، یا تنگ کالے اور سیاہ فراکوں میں عورتیں مسکراتی ہوئی، سانسیں پھولی ہوئی مردوں کے ساتھ ناچ رہی تھیں ایک ٹھنگنا سا کالا آدمی "معمر" یقیناً پنشن یافتہ، ایک جوان یعنی ایک تیس سال کی لڑکی کے ساتھ ناچ کے فرش کی طرف جا رہا تھا۔ یہ لڑکی اس کی کون ہو گی۔ لڑکی؟ شلوار پہنے تھی یعنی بمبئی میں ریس کورس کا فینسی ڈریس۔ اس کی بیٹی؟ نہیں اس نے تو اس لڑکی کو چمٹا کے ناچنا شروع کیا۔ لڑکی کا قد اس سے آٹھ انچ زیادہ بلند ہے، اور عمر میں وہ اس سے تیس سال چھوٹی ہے۔ یقیناً یہ اس کی محبوبہ ہے۔ کوئی لڑکی جو شخص ولنگڈن کلب میں ہفتے کی شام کی بہار دیکھنے اس کے ساتھ آئی ہے، شاید وہ ماہیم یا دادر کی طرف کسی اسکول میں پڑھاتی ہے یا کسی ہسپتال میں نرس ہے یا اس کا باپ نچلے متوسط طبقے کا آدمی ہو گا۔ اور ممکن ہے وہ اس ٹھنگنے سے بوڑھے کالے آدمی کا ماتحت، منشی ہو۔

میں نے خورشید مقدس جی سے پوچھا تو وہ انگریزی میں کہنے لگے۔ "تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ یہ بھڈکے اور مسز بھڈکے ہیں۔ بھڈکے سب سے پہلا ہندوستانی تھا جو سی ایس ریلوے میں چیف کمرشل منیجر کے عہدے تک پہنچا، اور یہ اس کی دوسری بیوی ہے۔ یہ بھی بڑے اچھے خاندان کی ہے، اس کا باپ پولیس کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ اور تم نے بوڑ گاوں کر کا نام سنا ہو گا نا جو سپیرس اور مائنرس میں تھا، جسے وکٹوریا کراس ملی، بچارا اندھا ہو گیا۔ یہ اسکی بہن ہے...."

میں نے کہا۔" مگر یہ تو عمر میں بہت چھوٹی ہے، پھر ذرا اس کی صورت دیکھئے اور اس بوڑھے کو دیکھئے۔ حور کے پہلو میں لنگور۔ ...."

" اجی ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔" خورشید مقدس جی نے کہا۔" مگر وہ اچھے طبقے کی تو ہے۔ اصلی چیز یہ ہے لڑکی اچھے طبقے کی ہو خواہ وہ بیوی بنے یا معشوقہ ..... اچھا ذرا معاف کرنا۔ ادھر مسز کرسٹ جی بیٹھی ہے۔ میں ذرا ایک سٹیپ ناچ کے آتا ہوں۔ کہو تو تم کو بھی کسی اچھی لڑکی سے ملا دوں ...... اس سے ملتے ہو؟"

یہ کہہ کے خورشید مقدس جی نے ایک پارسی عورت کی طرف اشارہ کیا۔ جس کی ساڑی کا بارڈر اس کے چہرے سے زیادہ حسین تھا، ایک امریکن ملاح افسر کے بازو پہ لٹکی ہوئی وہ ناچ کے فرش کی طرف چلی جا رہی تھی۔

" نہیں معاف کیجئے۔ میں انور جی سے باتیں کرتا رہوں گا۔"

" ہا۔ ہا۔ ہا۔" خورشید مقدس جی اپنی دانست میں اپنے بے مثل مذاق پر خوش ہو کے آہستہ آہستہ ہنسے اور پھر مسٹر اور مسز کرسٹ جی کے میز کی طرف جا نکلے۔

باہر جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے سبزہ بڑا خوبصورت تھا، اور لان پہ میز ہی میز تھے میں نے انور جی سے باتیں کرتے کرتے اِدھر اُدھر گردن گھما کے دیکھا۔ عورتیں بڑے خوش وضع لباسوں میں تھیں۔ بمبئی کی تجارت اس کی تہذیب پر اتنی چھائی ہوئی ہے، کہ عورت اور مرد کے رشتے میں بھی تجارت کا ذرا تعلق سا ہے، اور لکھ پتی تاجر، اور کارخانوں کے مالک جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک ایسی بین الاقوامیت لئے ہوئے جس کی تہہ

میں گجرات اور بمبئی ہے۔ بمبئی کی تہذیبی رسم سورت میں کمپنی بہادر کے کارخانوں اور سالسٹ اور بسین کی ہے۔ پارسی ہندو اور مسلمان، گجراتی اور مرہٹے، خوجے، بوہرے اور ہمین اتنے تمدن، اتنے آئین و رسوم۔ اور یہ سب اس تجارتی بین الاقوامیت میں گم ہو جاتے ہیں، جس کا نام بمبئی ہے۔

ناچ کے بعد خورشید مقدس جی، مسز کرسٹ جی کے ساتھ مسٹر کرسٹ جی کو بھی اپنے ہی میز پر لے آئے۔ مسز کرسٹ جی چھوٹی سی تھی، ذرا پھیلی ہوئی، دانتوں کے درمیان ذرا ذرا سی جگہ خالی، اور عمر کی دوپہر کا آغاز تھا۔ مسٹر کرسٹ جی بڑے نیاز مند قسم کے لوگ تھے بات کم کرتے، ٹھہر ٹھہر کے کرتے، اور بات کرنے سے پہلے سوچ لیتے کہ کوئی حماقت کی بات تو نہیں کر رہے ہیں، پھر بھی زیادہ تر باتیں ایسی ہی کرتے جن میں اگر حماقت کو زیادہ دخل نہیں تھا تو عقلمندی بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

سنبھل سنبھل کے، ٹھہر ٹھہر کے انہوں نے انور جو سے اس کا پیشہ دریافت کیا۔ اور پھر اپنے گھر کے عجائبات کا ذکر کرنے لگے۔ ان کے دادا نے سورت میں کمپنی بہادر کے ساتھ ساتھ ترقی کی تھی۔ اور ان کے والد کو سر کا خطاب ملا تھا۔ اگر دانشمندی سے اتنے زیادہ معذور نہ ہوتے تو موجودہ کرسٹ جی کو بھی سر کا خطاب کب کا مل گیا ہوتا۔ انہوں نے انور جو کو اپنے گھر کے عجائبات دکھانے کے لئے گھر چل کے وہسکی پینے کی دعوت دی اور ساتھ ہی ساتھ خورشید مقدس جی کو اور مجھے بھی مدعو کیا ہے۔ خورشید مقدس جی نے گجراتی گفتگو کا مطلب ہمیں سمجھایا۔ اور اب سوا آٹھ ہو رہے تھے، گھر کی طرف جانا تو تھا ہی۔

کلب کے باہر اپنی نیلی بیوک کے دروازے کے پاس خورشید مقدس جی بڑے شاہانہ انداز سے کھڑے ہو گئے، ایک پیر پر گھوم کے دروازہ کھولا۔ مسز کرسٹ جی پیچھے کی نشست پر بیٹھنے لگی تو انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ ٹھہر گئی اور مسٹر کرسٹ جی بڑی ہی روادار شائستگی سے مسکرائے۔ مسز کرسٹ جی سامنے کی نشست پر بیٹھ گئی، اور خورشید مقدس جی نے اسٹیرنگ وہیل سنبھالا۔ ہم سب پیچھے بیٹھے اور وارڈن روڈ ہوتے ہوئے ہارکنس روڈ کی طرف چلے جہاں کرسٹ جی کا سو سال پرانا مکان تھا۔

تی تانیو کی ایک آرامیدہ زہرہ تھی، جس کے متعلق رک رک کے، ٹھہر ٹھہر کے مسٹر کرسٹ جی نے ہم سب کو یقین دلایا کہ "یہ اصلی ہے" اور اس کے دادا اسے بولونیا سے خرید کے لائے تھے۔ پھر مسٹر کرسٹ جی نے ہم سب کی صورتیں دیکھیں، خورشید مقدس جی ایک صوفے کی آڑ میں مسز کرسٹ جی کا ہاتھ مروڑ رہے تھے، اور ہم لوگوں کو تو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ تصویر کا رنگ و روغن ذرا نیا نیا ملے ہے، اور یہ اصل نہیں بالکل حال حال کی نقل ہے لیکن یوں مجھے تصویروں کی زیادہ پہچان بھی نہیں.......

بہر حال ایک چیز ضرور دلچسپ تھی، سنگِ مرمر کے میز پہ کمرے کے ایک سرے پر ایک منقش چوبی پردے کے آگے، انیسویں صدی کی بنی ہوئی ایک بڑی سی گھڑی رکھی تھی، اس کے متعلق بہت تامل اور انکسار سے کرسٹ جی نے کہا کہ یہ ایک فرانسیسی کمپنی نے ترکی کے کسی سلطان کے لئے بنوائی تھی۔ اوپر ایک سنہرا ہلال تھا، اور ڈائل پر فرانسیسی عبارت ترکی نما حروف میں لکھی ہوئی تھی۔ اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی چیزیں بڑی دلچسپ تھیں

برک آبریک ۔چینی گلدان، جے پور کے سنگِ مرمر کے کھلونے، پرانی تصویریں، فرنیچر لوئی چہاردھم کے زمانے کی نقل تھا۔اور کرسٹ جی نے انکسار سے دونوں ہاتھ مل کے، اور پھر ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کے کہا۔یہ سب سامان میرے دادا پہلے کرسٹ جی کا فراہم کیا ہوا ہے۔جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں سورت میں...... پھر ان کا لہجہ انکسار، خاکساری اور مصنوعی شرمیلے پن سے اس قدر مدھم ہو گیا کہ باقی الفاظ صاف سنائی نہیں دیئے۔صوفے کے پیچھے خورشید مقدس جی نے مسز کرسٹ کا ہاتھ پھر مروڑا اور مسز کرسٹ جی آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا کے ہٹ آئی۔

خورشید مقدس جی نے کہا۔"دیکھو میں آبان (یہ مسز کرسٹ جی کا نام تھا) سے کہہ رہا تھا۔تمہارا نام کرسٹ، اصل میں خورشید ہے۔یہ کرسٹ خورشید کا انگریزی تلفظ ہے نا؟ سورت میں ایسٹ کمپنی کے زمانے میں تمہارے دادا نے یہ تلفظ بنا لیا ہوگا۔تو دیکھو مینو (یہ مسٹر کرسٹ جی کا نام تھا) ہم بھی خورشید تم بھی خورشید اور خورشید پارسیوں کے لئے مقدس ہے۔اس لئے ممکن ہے کہ ہمارے باپ دادا بھی کسی زمانے میں پارسی ہوں۔"

اتنے میں بٹلر وہسکی کی بوتل، اور سوڈا بنانے کا شیشہ لایا۔دوسرا بٹلر اس عجائبات سے بھرے ہوئے ڈرائنگ روم سے مناسبت رکھنے والی ایک چینی کی کشتی میں کٹ گلاس کے خوش وضع کام کے گلاس لایا۔اور مسز کرسٹ جی میزبانی کے فرائض انجام دینے لگیں۔سب کے لئے انہوں نے ایک ایک گلاس میں "بڑا پیگ" انڈیلا۔اور بٹلر ہم لوگوں کے سامنے گشت کرنے لگا۔

کٹ گلاس پر بجلی کا قمقمہ کئی جگہ سے چمک رہا تھا۔ کرسٹ جی نے اپنے گلاس سے ایک چھوٹے سے آٹھ انچ کے مجسمے کی طرف اشارہ کیا۔ اور ہم سب اس مجسمے کے اطراف جمع ہو گئے۔ یہ کرسٹ جی کے سورت والے پردادا کا چھوٹا سا سنگِ مرمر کا مجسمہ تھا۔ قدیم پارسی لباس اور ٹوپی، مکمل، اتنی خوبصورتی اور نزاکت سے بنا ہوا کہ شال کے کشمیری نقش و نگار بھی سنگِ مرمر کے اس چھوٹے سے مجسمے پر ترشے ہوئے تھے۔

مسٹر کرسٹ جی ذرا ذرا احمق ضرور ہے، مگر وہ غرور اور تصنّع اور اکڑ جو خورشید مقدس جی ایسے نودولتوں میں ہے۔ اُس میں نہیں اور بہرحال اُس میں خورشید مقدس جی سے بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ جب وہ اپنے دادا کا مجسمہ دکھا رہا تھا تو خورشید مقدس جی وہسکی کے ہلکے ہلکے سرور میں کسی سے مخاطب ہوئے بغیر آپ ہی آپ آہستہ آہستہ ہنس رہے تھے۔ "ہا۔ ہا۔ ہا" اور ان کی ہنسی یقیناً کرسٹ جی کو ناگوار گذر رہی تھی۔

مسز کرسٹ جی بات چیت کی حد تک بہت سلجھی ہوئی تھی، بڑی شائستہ مگر مجھے تو وہ بڑی غیر دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ معلوم نہیں خورشید مقدس جی کو اُس میں "اعلیٰ طبقے" کے سوا اور کون سی کشش نظر آتی تھی۔

وہسکی کے نشے میں میں اپنی فیلٹ ہیٹ وہیں مسٹر کرسٹ جی کے ہیٹ اسٹینڈ پر بھول آیا اور واپسی پر اپنے میزبان راجہ باجپائے سے جو کھانے پر ابھی تک میرا انتظار کر رہے تھے، میں نے کہا۔ "راجہ کرسٹ جی بیوقوف ضرور ہے، مگر اچھا بیوقوف۔ یعنی اس سے دوبارہ ملنے کو طبیعت چاہتی ہے۔"

"اور مسز کرسٹ جی؟ خورشید مقدس جی تو اُس پر بہت مرتا ہے......"

سوپ پیتے ہوئے میں نے منہ بنایا۔ اور راجہ باجپائے اپنے دانتوں میں خلال کرنے لگے۔

وہ ڈبہ جس میں بیٹھا ہوا میں جوگیشوری جا رہا تھا بی اینڈ سی آئی کا اچھا خاصا سیکنڈ کلاس کا ڈبہ تھا۔ اخبار کے پیچھے ایک شخص کا ہاتھ پھر اس کا منہ نظر آیا۔ ہاتھ اور منہ دونوں پر جذام کے داغ تھے۔ مرض کا پھیلنا ضروری ہے۔ پانچ انگریز افسر تھے۔ سب کے سب کپتان۔ ان کے ساتھ تین پارسی لڑکیاں تھیں۔ آٹھوں کے ساتھ نہانے کے جوڑے تھے۔ آج اتوار کا دن تھا اور یہ سب کے سب جُہو جا رہے ہوں گے۔ ایک غنڈہ جذامی کے پاس آ کے بیٹھ گیا اور تینوں پارسی لڑکیوں کی طرف گھورنے لگا۔ پارسی لڑکیوں نے منھ پھیر لیا اور اپنے ساتھی انگریز کپتانوں سے باتیں کرنے لگیں۔

جوگیشوری کے اسٹیشن پر میں اترا، اور مسافروں کے ہجوم سے ذرا الگ میں نے دیکھا کہ چالیس سال کا ایک لنگڑا جس کے دونوں پاؤں سُوکھے اور مڑے ہوئے ہیں، بارہ برس کے ایک لڑکے کی پیٹھ پر سوار ہے۔ معلوم نہیں یہ لڑکے کا باپ ہے، ماموں ہے، چچا ہے، کون ہے۔ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے بارہ برس کے لڑکے پر ابھی سے بڑھاپے کے آثار ہیں، اس کے ماتھے پر جھرّیاں پڑنی شروع ہو گئیں ہیں۔ آنکھیں زرد اور مردہ سی ہیں اور انکے اطراف سیاہی ہے۔ پیرِ تسمہ پا کا شکنجہ اس کے کاندھوں پر کسا ہوا تھا۔

باوجود اس کے کہ میں بیکار ہوں اور ایسی باتوں پر غور نہیں کیا کرتا۔ پھر بھی اس عجیب منظر کو دیکھ کے میں ٹھٹک سا گیا۔ ایک دن اس بارہ برس کے لڑکے کو دفعتاً یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ اس پیرِ تسمہ پا کے بوجھ سے آزاد ہو سکتا ہے۔ وہ اس کو چھوڑ کے کہیں بھاگ جائے گا، اور یہ لنگڑا چوہے کی طرح سسک سسک کے، رینگ رینگ کے مرے گا۔

پنچ محل تک وکٹوریا کا کرایہ دو روپیے ہوا۔ جنگ سے پہلے وکٹوریا والا بارہ آنے لیتا تھا۔ پنچ محل کی دیواریں دس دس فیٹ اونچی ہیں، اور چور آنا چاہے تو نقب لگا کے آئے۔ دس فیٹ اونچی دیوار پہ گھاس اگی ہوئی ہے۔

ایک ملاح لڑکا جو کوکب کا بھائی نکلا، وکٹوریہ والے کی آواز سن کے پھاٹک کے قریب دیکھنے آیا کہ کون ہے۔ اس ملاح لڑکے کو کمیشن مل کے شاید ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ اس کی سفید وردی صاف شفاف چمک رہی تھی۔ مسٹر حسین نے "آہا" کہہ کے خیر مقدم کیا۔ میں ابھی کوکب سے کہہ رہا تھا کہ اور سب نے تو آج آنے کا قطعی وعدہ کیا تھا، صرف آپ کے آنے کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

عورتوں کا انبار کا انبار تھا۔ ایک ناریل کے درخت کے نیچے دو عورتیں ایک سوزنی پر دراز تھیں، ایک پارسی عورت ان کے قریب بیٹھی ہوئی کچے ناریل کا پانی آہستہ آہستہ پی رہی تھی۔ دو منزلے مکان کے سائے میں ایک قالین بچھا ہوا تھا۔ جس پر ایک تیس سال کی لڑکی، اپنی دونوں ہتھیلیوں کو تکیہ بنائے لیٹی آسمان کی طرف دیکھ رہی

تھی۔ ملاح لڑکا اس کے قریب جا کے بیٹھ گیا۔ تین کرسیوں پر مسٹر حسین کے ساتھ، دو اور آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک کا تعارف رستم بھائی کہہ کے کرایا، اور پھر مسز رستم بھائی کی طرف اشارہ کر کے تعارف کرایا، وہ کچا ناریل کھاتے کھاتے مسکرائی۔ رستم بھائی کے ساتھ دوسرا آدمی جو تھا، اس کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی پستہ قد کم رو آدمی تھا، کسی ریلوے کا وظیفہ یاب چیف کمرشل منیجر جس کو میں نے کل شام کو ولنگڈن کلب میں دیکھا۔ اور پھر جیسے ہی مسٹر حسین نے تعارف کراتے ہوئے مسٹر اور مسز بھڈکے کہا، مجھے دفعتاً خیال آ گیا کہ یہ تیس سال کی عورت جو مکان کے سائے میں قالین پر لیٹی ہوئی اپنی دونوں ہتھیلیوں کا تکیہ بنائے آسمان کی چوندھیا دینے والی روشنی کی طرف دیکھ رہی ہے، مسز بھڈکے ہے، جو اپنے شوہر کے ساتھ شلوار پہنے ہوئے کل ولنگڈن کلب میں ناچ رہی تھی اور میں نے خورشید مقدس جی سے کہا تھا "حور کے پہلو میں لنگور ......"

کوکب نے اٹھ کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور مسٹر حسین نے مذاق میں کہا۔ "اور اگر آپ ان سے واقف نہیں تو میں ان سے آپ کا تعارف کراتا ہوں۔ یہ میری بیوی کوکب ہیں....."

میں ہنسا۔ کوکب ہنسی۔ اس نے ایک کچا ناریل مجھے بھی دیا اور کہا۔ "میں ان سے اس زمانے سے واقف ہوں، جب میں آپ سے ملی بھی نہ تھی، اور آپ سے شادی کرنے کا خیال میرے ذہن میں آنے بھی نہ پایا تھا۔"

ایک ہلکا سا تاریک سایہ، کڑی دوپہر میں ہلکے سفید ابر کے سائے کی طرح چھا کر مسٹر حسین کے چہرے پر سے گذر گیا۔ مسٹر رستم بھائی ہان کانگ اور نانکنگ کے قصے

سنا رہے تھے، جہاں ریشم کی تجارت میں انہوں نے عمر کا بڑا حصّہ گذارا تھا۔

کوکب روپہلی اشرفیوں کا بلاوز اور سادی جارجٹ کی سفید ساڑی پہنے تھی۔ اس کے چوڑے گورے حسین چہرے پر شباب کی تازگی تھی اور اس کی آنکھوں سے جھوٹ اور ریا کی جھلک مٹتی جا رہی تھی۔ کیسی غلطی، کیسی بڑی غلطی اس نے کی تھی۔ وہ صابن کے جھاگ اور بلبلوں کے پیچھے دوڑتی رہی اور اسکی آنکھوں پر پٹی کس کے، زندگی اُسے دھکّے دے کے بازو سے نکل گئی۔

میرے دل میں بھی کانٹا ٹوٹ گیا تھا اور کسک باقی رہ گئی تھی۔

تعارفوں کا سلسلہ ختم نہیں ہؤا تھا۔ وہ دو عورتیں جو مسز رستم بھائی کے قریب لیٹی ہوئی تھیں، مسز سنگھ، اور مس چند تھیں۔ ان میں سے مس چند کم سواد، کم رنگ، کم رُو رستم بھائی کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔

اور رستم بھائی یانگ چاؤ کی خوبصورت جھیل کا حال سنا رہے تھے، جس کا مقابلہ مسٹر پھڈکے لن یوٹانگ کے ناولوں کے بیانات سے کر رہے تھے۔

مسٹر حسین مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے، اور پھر جب ہم رستم بھائی کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ یانگ چاؤ کی جھیل میں کشتی رانی چھوڑ کے جاپان سے ہندوستان ریشم بھجوا رہے تھے۔ ان کی باتوں میں بڑی انسانیت، متانت اور شرافت تھی۔ اور مسٹر رستم بھائی مجھے پسند آئے۔ ان میں بڑی ہی شائستگی تھی جو نہ ہندوستان کی تھی نہ بمبئی کی جو انہوں نے غالباً چین میں سیکھی تھی۔ کچھ اسی طرف کی شائستہ سنجیدگی۔

مسز رستم بھائی کے متعلق معلوم ہؤا کہ وہ کبھی چین نہیں گئیں۔ مسٹر پھڈکے چین

تو نہیں انگلستان میں البتہ کئی سال رہے تھے اور کہتے تھے کہ ایک زمانے وہ فی بین سوسائٹی کے ممبر بھی تھے۔

مجھ سے نہیں رہا گیا۔ تھوڑے ہی دن ہوئے میں نے روس کے متعلق ایک موٹی تازی کتاب پڑھی تھی۔ جو راجہ صاحب نے مجھے بڑی تاکید سے پڑھنے کے لئے دی تھی۔ اسی کی بنا پر رستم بھائی اور مسز پھڈ کے سامنے میں نے دعویٰ کر دیا کہ میں بھی ذرا روس تک ہو آیا ہوں۔ میں بالشویکوں کے طرزِ حکومت کی تعریف کر رہا تھا۔ اور کوکب حیرت سے میرے سفید جھوٹ سن رہی تھی۔ اُسے اچھی طرح معلوم تھا میں نے کبھی ہندوستان سے باہر قدم نہیں رکھا۔ مگر میں تھا کہ ماسکو اور کیف اور وسط ایشیا کی داستانیں سناتا ہی جا رہا تھا۔ اور مسٹر پھڈ کے منہ کھولے ہوئے سن رہے تھے مسٹر رستم بھائی بے اعتباری سے ایک دو بار مسکرائے۔ مگر زبان سے اخلاقاً کچھ نہیں کہا۔ میں نے اپنا سفر لینن گراڈ سے شروع کیا، ماسکو پہنچا، کیف پہنچا اور پھر سمرقند اور مرو آ کر دم لیا۔ جہاں پہاڑ تھے وہاں دریا بسا دیئے، جہاں دریا تھے، وہاں ریگستان پھیلا دیئے۔ اور مسٹر حسین نے انگریزی میں تو نہیں اُردو میں آہستہ سے کہا۔

"جہاندیدہ بسیار گوید دروغ"

میں ان کے اس شعر کو اَن سنا کر کے مسٹر پھڈ کے کو سوویٹ روس کی خاندانی زندگی، اور جنسی عیاشی کے حیرت ناک قصے سناتا جا رہا تھا۔ اور کوکب میزبان کی بیوی کی حیثیت سے ہنسی ضبط کر کے کچے ناریل سب کو دیتی جا رہی تھی۔

اتنے میں مہمانوں کے دو اور جوڑے آئے۔ دو نوجوان بُش شرٹ پہنے ذرا رنگا رنگ قسموں کی، ان کے ساتھ دو نوجوان خواتین تھیں۔ ان میں سے ایک یقیناً خوبصورت تھی مگر اسے حمل کا کوئی چھٹا ساتواں مہینہ ہوگا۔ دوسری کے ہونٹ موٹے موٹے تھے، مگر بڑی اعلیٰ درجے کی بنارسی ساڑی پہنے تھی۔

اب باہر بیٹھنے کی جگہ ذرا کم تھی۔ کوکب سب خواتین کو اپنے ساتھ سمیٹ کے مکان کے اندر لے گئی۔ اس کے جانے کے بعد پنج محل کے صحن میں خلا ہی خلا تھا۔

خواتین کے جاتے ہی گفتگو کا رخ بدل گیا۔ جو دو نوجوان ابھی ابھی آئے تھے ان میں سے ایک صاحب آغا خانی تھے، اور میزبان کے اس اعتراض کا جواب دے رہے تھے کہ جن ہیروں میں آغا خاں تولے جانے والے ہیں۔ ان کے لئے غریبوں نے بھی چار آنے مہینہ چندہ دیا ہے۔ اور مسٹر پھڈ کے مہاراجہ بھینسواڑ کے دیوان کا ذکر کر رہے تھے کہ وہ ہر ماہ شراب اتنے روپیوں کی پی جاتے ہیں کہ اس سے ایک چھوٹا موٹا ہسپتال کھولا جا سکتا ہے، اور بھینسواڑ کے لوگوں کو تو چبینہ میسر نہیں، اور یہاں مہاراجہ کے گھوڑے ہیں کہ......

اتنے میں مسٹر حسین دونوں نو وارد نوجوانوں کو کوئی جنسی لطیفہ سنانے لگے جس پر دونوں قہقہہ مار کے ہنسے۔ ان نوجوانوں میں سے دوسرا مسٹر خان مدراسی تھا۔ مگر اردو اس صفائی سے بولتا تھا جیسے کوئی یو۔پی کا رہنے والا بولے۔ کہنے لگا وسیم کے نام سے اردو میں مختصر افسانے لکھ لیتا ہوں جو اکثر "گلشن" دہلی میں شائع ہوتے ہیں

وہ سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی سے مل چکا تھا، اور ان کے مدّاحوں میں سے تھا۔ پھر اس موضوع پر گفتگو ہونے لگی کہ جنگ کی وجہ سے بمبئی میں مکان اور فلیٹ نہیں ملتے۔ "پگڑی" دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سینکڑوں کی جگہ ہزاروں کی پگڑی دو، تب کہیں جا کے کوئی فلیٹ لو۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا کہ جنگ کے بعد بھی مکان اور فلیٹ ملنے کی تکلیف بہت دن باقی رہے گی۔ اور اس کے بعد کپڑوں کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ اصلی ریشم کے متعلق جس کی پہچان یہ ہے کہ جب دھویا جائے تو پیلا پڑ جائے۔ شارک اسکن کے متعلق جو لکڑی کو کوٹ کے بنایا جاتا ہے۔ شارک اسکن سے مسٹر خان کو بڑی دلچسپی تھی۔ اور انہوں نے پچیس روپے فی گز تک شارک اسکن خریدا تھا۔ اپنی کرسی انہوں نے مسٹر رستم بھائی کے قریب کر لی اور غور سے شارک اسکن کے ملنے کے امکانات پر غور کرنے لگے۔ یہ گفتگو ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ کوکب کے بغیر خلا ہی خلا تھا۔ میں نے ناریل کے اونچے درخت کی پُھننگی کی طرف دیکھا اور شارک اسکن کے متعلق گفتگو کی عام سطح سے بلند ہونے کی کوشش کی، یہاں تک کہ میزبان کی خاتون نے سیڑھیوں پر سے چلّا کے کہا "چائے تیار ہے!"

چائے اچھی تھی، بہرحال دیر ہو رہی تھی، چائے پینے سے سر کا درد جاتا رہا۔ کئی طرح کے کیک تھے، پیسٹریاں تھیں۔ اور کھانے کے دوران میں میں زیادہ تر مسٹر خان سے باتیں کرتا رہا۔ کبھی شارک اسکن کے متعلق اور کبھی ان کے اپنے افسانوں کے متعلق

ڈرائنگ روم بڑا اچھا سجا ہوا تھا۔ برآمدے سے نمکین، مسطح، کالی زمین پر ناریل کے درختوں کے جھنڈ بڑے خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ کسی نے بمبئی کا قلابہ عدن سے جا ملایا تھا۔ واپسی میں مسٹر رستم بھائی، مسٹر بھڈ کے (جو روس کے مزید حالات سننا چاہتے تھے) اور مسٹر خان نے میرا ٹیلیفون نمبر مانگا اور میں نے راجہ باجپائے کا ٹیلیفون نمبر بتا دیا۔ سب کے جانے کے بعد مسٹر حسین نے مجھے روک لیا۔ میں، ملاح لڑکا، کوکب اور مسٹر حسین باہر صحن میں بید کی کرسیوں پر بیٹھے۔ میں نے مسٹر رستم بھائی کی تعریف کی۔ مسز رستم بھائی بھی بڑی شائستہ عورت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے بے خیالی میں کہا ”مگر دونوں کی عمروں میں بڑا فرق ہے۔“

”دونوں کی عمروں میں بڑا فرق ہے، پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے بہت خوش ہیں۔ کوکب نے یہ کہا۔ اور اس کی آنکھ میں ایک چنگاری سی بجھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مسٹر حسین کے چہرے پہ سفید بادل کا ٹکڑا ایک لمحہ کے لئے سایہ ڈال کے غائب ہو گیا۔ اور ان کی کنپٹی کے کھچڑی کھچڑی بال ان کی پھیکی مسکراہٹ کی دھوپ میں چمکنے لگے۔

راجہ باجپائے مجھ سے بہت دنوں سے کہہ رہے تھے کہ یونیورسٹی کا نوو کیشن ہال میں ایک بین الاقوامی نمائش ہے۔ اس کا دیکھنا اس لئے ضروری ہے کہ پچاس فی صدی دعوتوں میں اُس کا ذکر ہوتا ہے۔ راجہ باجپائے نے کہا ”چلو اُسے دیکھ

آئیں، ورنہ دعوتوں میں جب نمائش کے متعلق گفتگو ہوتی ہے تو مجھے جاہلوں کی طرح خاموش بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ میں بڑا جاہل اور ان پڑھ محسوس کرتا ہوں۔"

لیکن راجہ باجپائے اس روز نمائش دیکھنے گئے جب میری دعوت مسٹر اور مسز حسین کے یہاں تھی۔ میں ان کے ساتھ نہ جا سکا۔ وہ واپس آئے تو اپنے تمام مہمانوں سے کھانے پر بار بار نمائش کا ذکر کرتے، اور اب میری اپنے آپ کو ان پڑھ اور جاہل محسوس کرنے کی باری تھی۔ میں نے خیال کیا کہ چلو اس نمائش کو دیکھ ہی آئیں کچھ دیر نیپین سی روڈ پر بس کا انتظار کیا۔ پھر ارادہ کیا کہ ذرا اوپر چڑھ کے والکیشر روڈ سے دوسری بس کا انتظار کیوں نہ کروں۔ بس اسٹینڈ پر چار پانچ منٹ تو میں اکیلا کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک پینتیس سال کی پارسی عورت آئی۔ سوکھے ہوئے ہونٹ جن پر اس نے سرخی نہیں لگائی تھی۔ اچھی خاصی مگر ایسی زیادہ خوبصورت بھی نہیں۔ کوئی پینتیس سال کی عمر ہو گی۔ میں نے بس کے متعلق گفتگو شروع کی، اور اس نے جواب دیا۔ پھر وہ ذرا اور کھلی۔ اس نے بتایا کہ پونا میں بچوں کو پڑھایا کرتی تھی۔ اب نیپین روڈ پر ایک بڑے پارسی گھرانے میں لڑکیوں کو سکھانے پر نوکر ہے۔ بس آج بیس منٹ دیر سے آئی اور اس اثنا میں وہ کبھی باتیں کرتی، کبھی خاموش ہو جاتی۔ یہاں تک کہ دو ایک پارسی بوڑھیاں آئیں اور صاحب جی کہہ کے وہ ان سے باتوں میں لگ گئی۔ بس آئی۔ میں نے غلطی یہ کی کہ اسی کی سیٹ پر اس کے پاس نہیں بیٹھا۔ دوسری بنچ پر بیٹھا۔ اس سے رخ بدل گیا، معاملہ بگڑ گیا۔ ہم جب فلورا فونٹین کے قریب پہنچے تو پھر اجنبی بن چکے تھے

اور بس میں معلوم نہیں کس ترکیب سے ایک کملے کیڑے کا بچہ میرے کوٹ کی سیدھی آستین پر چڑھ گیا۔ ایک لالہ صاحب جو میرے پاس بیٹھے تھے انہیں یہ بہت ناگوار گزرا اور انہوں نے مجھے چھوٹے سے دشمن کی خبر دی۔ میں نے کمل کیڑے کو جھٹکا تو وہ نشست پر گرا، اور لالہ جی کپڑے جھٹک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کیڑے کو نیچے پھینک دیا۔ مگر لالہ جی نے دوبارہ بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ "نہیں جی ہم ادھر اُٹھنے مانگتا۔"

کانووکیشن ہال میں نمائش تھی۔ بین الاقوامی نمائش سے مجھے کیا خاک دلچسپی ہوتی میں تو ان لڑکیوں کو دیکھنے آیا تھا جو نمائش دیکھنے آئی تھیں۔ تین چھوٹی سی مرہٹہ لڑکیاں، ایک لانبی اور ذرا ویران ویران صورت کی، دوسری متوسط قد کی مگر بہت کالی، تیسری پستہ قد اور خوش رو آئیں، اور دربان ان سے حجت کرنے لگا کہ اپنی کتابیں یہیں چھوڑتی جاؤ۔ شاید اسکول کی لڑکیاں تھیں، ان کی سمجھ میں نہیں آیا میں نے صورتِ حال سمجھائی کہ یہ نمائش کا قاعدہ ہے۔ لانبی لڑکی شکریے کے طور پر مسکرائی۔ نمائش کے اس حصے میں جہاں وسطِ ہند کی آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں کی تصویریں تھیں، ہندوستان کے متعلق، اور بعض بہت غیر متعلق کتابیں تھیں، ہوائی ڈاک کے لفافے اور ٹکٹ تھے، مغل راجپوت اسکول اور رابندر ناتھ ٹیگور کی جدید تصویریں تھیں، جیراڈ کے بنائے ہوئے نقشے اور چھوٹے چھوٹے تانبے اور پتھر کے مجسمے تھے، میں ایک اسٹال سے دوسرے اسٹال کی جانب تینوں مرہٹہ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ اس تعاقب میں ایک پارسی پروفیسر

خلل انداز ہوا جس نے زبردستی مجھے مخاطب کر کے ویریر ایلون کا ذکر چھیڑ دیا۔ ویریر ایلون نے ایک گونڈ عورت سے شادی کی تھی، یہ اس پارسی پروفیسر کو بہت ناگوار تھا۔ پارسی پروفیسر سے چھٹکارا حاصل کر کے میں پھر ان تینوں مرہٹہ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے ایک اسٹال سے دوسرے اسٹال کی جانب پھرنے لگا۔ میں نے پستہ قد اور خوش رُو مرہٹہ لڑکی سے موقع دیکھ کے ہندی کے لسانی نقشے کے متعلق محض بات کرنے کے لیے پوچھا۔ وہ کہنے لگی یہ حروف کا ارتقا ظاہر کرتا ہے اور میں اس کے لبوں کی حرکت دیکھتا رہا۔ دوسرے اسٹال پر میں نے پھر موقع دیکھ کر اس لڑکی کو چارلس جیرارڈ کے اس نقشے کا مطلب سمجھانا چاہا جس میں آرٹ کی تاریخ کا خلاصہ تھا۔ وہ مسکرا کے آگے بڑھ گئی۔ میں ایک اسٹال کے بعد دوسرے اسٹال کو ان تینوں کے ساتھ پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ کچھ اور مغل تصویریں نظر آئیں جن کے نام درج نہیں تھے۔ میں نے پستہ قد خوش رُو مرہٹہ لڑکی سے موقع پا کے پوچھا کہ آپ کے پاس جو فہرست ہے اس میں شاید ان تصویروں کے نام ہوں۔ اس نے ورق اُلٹے پلٹے اور کہنے لگی نہیں فہرست میں بھی نام نہیں۔ پھر کہنے لگی میں نے فہرست اس لیے خریدی تھی کہ اس سے مدد ملے گی مگر یہ تو بالکل بیکار ہے، یہ کہہ کے وہ ہنسی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ نمائش کے باہر چل دی۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ تین تین لڑکیوں کا تعاقب کتنی حماقت ہے۔ یہ اکیلی ہوتی یا ان تینوں میں سے کوئی لڑکی اکیلی ہوتی تو شاید رسم و راہ کی صورت نکل سکتی۔ مجبوراً دل کو تسلی دینے کے لیے چینی نمائش میں چینی جیڈ اور جیڈ کا بنا ہوا ایک گلدان دیکھتا رہا۔ ایک چینی نمائش دیکھنے والوں کو نیم موسیقیانہ لہجے میں گلدان کے تاریخی اسرار و رموز سمجھا رہا تھا۔

کاؤس جی جہانگیر ہال جاتے میں تینوں مرہٹہ لڑکیاں پھر دکھائی دیں۔ مگر اب ان کا تعاقب

بیکار دن بیکار راتیں

مجھے تضیع اوقات معلوم ہوا۔ کاؤس جی جہانگیر ہال کے دروازے پر پارسی لڑکیاں مسکرا مسکرا کے نمائش کا مرقع بیچنے کے لیے بڑھیں۔ میں نے بڑی لاچاری سے منھ بنا کے اپنی جیبوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ "نہیں"۔ وہ ہٹ گئیں، اور ان میں سے ایک دوسری سے مخاطب ہو کے کوئی نیا امریکن گیت گنگنانے لگی۔ ثقافتی نمائش میں ایک شمال یا وسط یورپ کی لڑکی دیہاتی کپڑے پہنے ہوئے ایک داڑھی والے پول سے باتیں کر رہی تھی۔ کچھ دور پر ناروے کا پہلا قنصل جنرل اسی پارسی پروفیسر سے جس کو ویرا یلون کی شادی پر اعتراض تھا، باتیں کر رہا تھا۔ "ہاں برگن کے لوگ بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ ..... ہاں بے شک بے شک بڑے مہمان نواز۔ مگر اوسلو کے لوگ نہیں۔ نہیں۔ جب سے جنگ شروع ہوئی۔ میں ہی ..... ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں ..... میں ہی، میں ہندوستان میں ناروے کا پہلا قنصل جنرل ہوں۔"

بعض عجیب عجیب "مجموعے" تھے۔ ایک پکّا کانگریس والا یا شاید کمیونسٹ قسم کا نوجوان ایک بڑی خوبصورت سیاہ بالوں والی اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ پھر رہا تھا۔ ناروے کے اسٹال پر اس نے اپنی ساتھی حسینہ سے کہا "چلو، یہاں سے چلیں۔ ناروے میں بڑی سردی ہے۔" ناروے کا قنصل جنرل ان دونوں کی طرف دیکھ کے ذرا مسکرایا اور پھر پارسی پروفیسر سے باتیں کرنے لگا۔ اس کانگریس والے کھدر پوش اور سیاہ بالوں والی اینگلو انڈین لڑکی کے ساتھ مثلث کی تکمیل کے لئے ایک اور نیم سفید سے چہرے کا نوجوان تھا جو ممکن ہے۔ کہ برّاعظم یورپ کا یہودی ہو یا شاید بمبئی ہی کا کوئی اینگلو انڈین نوجوان ہو۔ وہ اس لڑکی

کی بھی کبھی توجہ اپنی طرف منعطف کرنے میں کوشاں تھا۔

پھر ٹینس کے دو ریکیٹ تھے ٹینس کی ریکٹوں کے ساتھ دونوں نوجوان لڑکیوں کی کمریں بھی ذرا ذرا لچک جاتیں۔

پھر جب پریاں رخصت ہونے لگیں تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے جو بڑی بیش قیمت بنارسی ساڑی پہنے تھی مجھ سے پوچھا کہ چین کہاں ہے۔ میں نے کہا ہندوستان اور چین کے اسٹال تو کانووکیشن ہال میں ہیں۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا کہ سویڈن کا اسٹال کہاں ہے میں اشارے سے بتانے لگا تو اس نے کہا "میں سمجھی نہیں" مجبوراً میں اسے سویڈن کے اسٹال تک لے گیا۔ اسے پہنچا کے میں واپس آنے لگا تو وہ کہنے لگی "یہاں تو کچھ بھی نہیں" گنگ ہاکون اور اس کا ولی عہد دونوں تصویروں سے اس کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔ میں نمائش کے باہر جانے لگا تو وہ کہنے لگی "میں اور سب اسٹال دیکھ چکی ہوں۔ اگر آپ کہیں جانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو پہنچا دوں" جو گاڑی اس کے سامنے کھڑی تھی ۱۹۳۶ء کے ماڈل کی رولس رائس تھی۔ مگر اس ادھیڑ عمر کی عورت کے پاؤڈر اور رنگ سے لپے ہوئے چہرے، اور اس کے لباس میں سینٹ کی تیز مصنوعی خوشبو سے مجھے کچھ ایسی گھن معلوم ہوئی کہ میں نے شکریہ ادا کیا اور اپنی جان چھڑا کے بھاگا۔

میرین ڈرائیو پر ایک میلا سا لگا ہوا تھا۔ گجراتی، مرہٹے، پٹھان، خوجے، میمن، بوہرے، پنجابی، عرب، یہودی، انگریز، مرد عورتیں بچے، غریب، خوشحال، امیر، اور سمندر، سمندر، سمندر۔ میں نے طے کیا کہ میرا جی بھر گیا ہے۔ اب کل راجہ باجپائی سے اجازت لے کے حیدرآباد

بیکار دن بیکار راتیں

واپس جاؤں گا۔ بیکاری کیسی عجیب زنجیر ہے، ایک شہر سے دوسرے شہر کو بھاگو مگر وہ ساتھ ساتھ ہے۔ تمام بیکاریوں سے زیادہ مہلک ذہنی بیکاری ......

سال بھر کے بعد حیدرآباد میں پھر اسی ذہنی بیکاری سے اکتا کے میں بمبئی آیا۔ اب ہنگامے ہو رہے تھے۔ کانگریس نے آئی۔ ان۔ اے کے لئے ہنگامہ کیا۔ کمیونسٹ پارٹی کا دفتر لوٹا گیا، اور ان کا چھاپہ خانہ توڑا گیا۔ مسلم لیگ نے رشید ڈے منایا۔ ہندوستانی بحریے نے بغاوت کی۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب شاید میری اور میرے جیسوں کی ذہنی اور عملی بیکاری ختم ہو۔ لیکن پھر ہندو مسلم فساد شروع ہوا۔ غنڈے کے چھرے پیٹھوں، گردنوں، آنکھوں میں بھونکے جانے لگے، موٹروں سے مشین گن نے بھائیوں پر گولیاں چلائیں، اور میں کھاتا پیتا، مزے اڑاتا بیکار پھر مطمئن ہو گیا کہ اس ملک میں کچھ نہیں ہو گا۔ شاید یہ آزادی کے قابل ہی نہیں۔ اور پھر اپنی بیکاری کا لطف اٹھانے کے لئے اور اس کو بھلانے کیلئے میں نے حیدرآباد سے بمبئی، بمبئی سے پونا، پونا سے دہلی، لاہور، مسوری، دارجلنگ کا چکر شروع کیا اور اگر ہو سکا تو ان گرمیوں میں میں امریکہ کا ایک چکر لگا آؤں گا۔ راجہ باجپائے تو پختہ ارادہ کر چکے ہیں۔